☆ مراحل انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے سیرتِ مطہرہ کا ایک منفرد مطالعہ

☆ اسلامی انقلاب کیلئے سرگرم عمل افراد کیلئے مشعل راہ

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ** کے گیارہ خطبات پر مشتمل ایک فکر انگیز کتاب

منہج انقلابِ نبویؐ

کا نیا ایڈیشن، جو حسن ظاہری ہی نہیں حسن معنوی کے اعتبار سے بھی سابقہ ایڈیشن پر فوقیت رکھتا ہے، چھپ کر آ گیا ہے۔

خوبصورت کمپیوٹر کمپوزنگ، عمدہ طباعت، چار رنگوں میں شائع شدہ دیدہ زیب سرورق،

صفحات : 375

قیمت (غیر مجلد) : 140 روپے

(مجلد) : 160 روپے

شائع کردہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 03-5869501

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے' پی ایچ ڈی' ڈی لٹ' مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد' ایم اے' ایم فل' پی ایچ ڈی'

معاون: حافظ عاکف سعید' ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر' پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

شمارہ ۴ | محرم الحرام ۱۴۲۱ھ — اپریل ۲۰۰۰ء | جلد ۱۹

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۰ روپے' فی شمارہ -/۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

گرلز کالج کے جونیئر وِنگ کا اجراء :
فیصلے میں تبدیلی!

"حکمت قرآن" کے گزشتہ شمارے میں ایک اشتہار کی صورت میں قرآن کالج فار گرلز کی توسیع کے حوالے سے اس ارادے کا اظہار کیا گیا تھا کہ نئے تعلیمی سال سے کالج کے جونیئر ونگ کے طور پر کلاس ششم تا ہشتم کا اجراء بھی کر دیا جائے گا ــــــ یاد رہے کہ رفقاء و احباب کی جانب سے مسلسل اور دیرینہ تقاضے کے پیش نظر گزشتہ سال اللہ کی توفیق سے قرآن کالج کے گرلز ونگ کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ گرلز کالج کے لئے جگہ کی فراہمی کا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے بعض اصحابِ خیر کے ذریعے پورا کرادیا تھا۔ (یہ عمارت قرآن اکیڈمی سے قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے) اور اس کو چلانے کے لئے محنتی اور باصلاحیت افراد کی ایک ٹیم بھی اللہ نے عطا فرما دی تھی۔ چنانچہ بحمد اللہ کالج نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ سال اوّل کی طالبات آئندہ ماہ بورڈ کا امتحان دیں گی اور پھر جولائی میں ان شاء اللہ نئے داخلے ہوں گے۔ یوں نئے تعلیمی سال سے 'سال اوّل اور سال دوم' دونوں کلاسوں میں تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

جہاں تک گرلز کالج کے جونیئر ونگ کے اجراء کا تعلق ہے' ہمیں افسوس ہے کہ خواہش کے باوجود ہم بعض وجوہات کی بناء پر اس کا اجراء کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بعض انتظامی مسائل اور دیگر رکاوٹوں کے باعث' جن میں اہم ترین مسئلہ طالبات کے لئے ٹرانسپورٹ کی فراہمی کا ہے' مناسب خیال کیا گیا ہے کہ اس معاملے کو آئندہ سال تک کے لئے مؤخر کر دیا جائے۔ آئندہ سال اگر ہم ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان شاء اللہ جونیئر ونگ کا آغاز بھی کر دیا جائے گا۔ السّعی مِنّا و الاتمام من اللہ○ ○

درس ۱۶

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ
شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

○

"طالب و مطلوب" کی نسبت کے حوالے سے
فلسفۂ دین کی اہم بحث

حقیقتِ جہاد سے متعلق بعض بنیادی باتوں کی وضاحت پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ اب ہمیں مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے پہلے باقاعدہ درس کا آغاز کرنا ہے جو سورۃ الحج کے آخری رکوع پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے اس مرحلے پر جو مضمون زیر بحث ہے اس سے اصلاً اس رکوع کی صرف آخری آیت ہی متعلق ہے' لیکن یہ پورا رکوع' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' قرآن مجید کے انتہائی جامع مقامات میں سے ہے۔ اور اس مرحلے پر کوشش یہ ہوگی کہ اختصار کے ساتھ اس پورے رکوع کے مفہوم کو کسی درجے میں بیان کر دیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے اس منتخب نصاب میں اب تک جتنے مضامین آئے ہیں ان کا ایک مختلف انداز اور اسلوب میں اجمالی اعادہ ہو جائے گا۔

دو تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ اس رکوع کی آیات کا مطالعہ کیا جائے' دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ان کا مستحضر رکھنا قرآن حکیم سے ایک ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لئے بہت مفید ہو گا۔ ایک بات تو اجمالاً پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کی ابتدائی اور اختتامی آیات نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ ویسے بھی ایک عام قاعدہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی غزل کا مطلع اور مقطع خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ قصیدے کا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خطبے کا اگر آغاز ایسا ہو کہ خطیب اپنے سامعین کی توجّہ کو جذب کرے اور اختتام ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین پر کوئی دائمی تاثر چھوڑ جائے تو وہ خطبہ کامیاب ہو گا۔ قرآن مجید اصلاً خطبے کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور اس کی اکثر سورتوں کی حیثیت خطبوں کی سی ہے۔ چنانچہ ان کے آغاز میں آنے والی آیات اور جن آیات پر ان سورتوں کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم بہت جامع' بہت مؤثر اور توجّہ کو جذب کر لینے والی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی چند آیات پڑھ چکے ہیں۔ ان آیات کے حوالے سے بھی یہ حقیقت سامنے آئی تھی' لیکن سورۃ الحج کے اس آخری رکوع کے حوالے سے یہ حقیقت مزید مبرہن ہو جائے گی۔

اس رکوع کی چھ آیات میں جامعیت کا جو عالم ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ پہلی چار آیات میں خطاب "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" (اے لوگو!) سے ہے۔ اور ان میں گویا کہ قرآن مجید کی وہ دعوتِ عام ہے جو وہ ہر فردِ نوعِ بشر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان آیات میں ان اصولوں کا خلاصہ آگیا ہے جن کو ماننے کی وہ دعوت دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی اصولِ ثلاثہ ہیں : (۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت۔ اسلام کا پورا قصر انہی تین بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ لہٰذا پہلی چار آیات میں "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" سے خطاب کا آغاز کر کے ان تینوں باتوں کا ایک ایسا جامع ملخّص پیش کر دیا گیا ہے کہ واقعتاً قرآن مجید کے اعجاز کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں خطاب ہے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے۔ یعنی

اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے' جنہوں نے ان باتوں کو مان لیا۔ اب اگلی دعوت جو ہے وہ دعوتِ عمل ہے۔ گویا کہ پہلی چار آیات میں دعوتِ ایمان دی گئی اور اب ماننے والوں پر جو فرائض اور ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کے جو تقاضے ہیں انہیں بیان کر دیا گیا۔ اور بڑی منطقی بات ہے کہ جنہوں نے مانا ہی نہیں اُن سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے کسی عملی تقاضے کا پیش کیا جانا بے معنی ہے۔ جنہوں نے خدا کو' یا رسول کو' یا آخرت کو نہیں مانا' اب ان سے کیا کہا جائے کہ نماز پڑھو یا دین کے لئے محنت اور جدّ و جُہد کرو۔ یہ سارے تقاضے دعوتِ عمل کے ہیں۔ یہاں ان کو دو آیات میں سمو لیا گیا۔ اس پہلو سے جب آپ اس پر مزید غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ یہ مقام اس اعتبار سے قرآن مجید کا جامع ترین مقام ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے' اور "وجوہِ اعجاز القرآن" پر بھی بہت بڑی بڑی محنتیں ہوئی ہیں' اس موضوع پر بڑی ضخیم تصانیف موجود ہیں' اور میرے نزدیک اعجازِ قرآن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وجوہ اعجازِ قرآن کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا احاطہ کیا جائے کہ قرآن کن کن اعتبارات سے معجزہ ہے۔ لیکن یہاں ایک خاص پہلو کی طرف توجّہ دلانی مقصود ہے۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوئی۔ اس کے اوّلین مخاطب ایک خاص قوم کے افراد اور ایک خاص معاشرہ میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے کچھ نظریات و عقائد تھے' کچھ مذہبی رسوم تھیں' اپنے خاص حالات اور معاملات تھے۔ قرآن حکیم کی گفتگو کے پس منظر میں حالات کے اس تانے بانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر قرآن ان سے صرف اصولی باتیں کہتا اور بڑے منطقیانہ اور فلسفیانہ انداز میں اونچی اونچی عقلی باتیں ان کے سامنے رکھتا تو شاید وہ انہیں اپنے سے اتنی زیادہ متعلق معلوم نہ ہوتیں۔ قرآن جس پس منظر میں اور جن ظروف و احوال میں نازل ہوا ہے اس کا عکس قرآن کے اسلوب میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن انہی سے مخاطب ہے' ساری بات انہی سے ہو رہی ہے۔ اسی ماحول اور environment سے اپنی گفتگو اور تمام دلائل کے لئے بنیاد فراہم کی جا رہی

ہے' لیکن دوسری طرف یہی کتاب ایک ابدی ہدایت نامہ ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے فلسفی' بڑے سے بڑے سائنس دان اور بڑے سے بڑے حکیم و دانا انسان کی علمی تشفی' اس کی علمی پیاس کی سیری اور اس کی عقل اور ذہن و فکر کی رہنمائی تا قیامِ قیامت اسی کتاب کو کرنی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ کس قدر کٹھن مسئلہ ہے۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں نازل ہونے والی ایک کتاب جو ایک طرف ایک اَن پڑھ قوم کو اپنے مخاطبینِ اوّل کی حیثیت سے اس طرح خطاب کرتی ہے کہ وہ قوم بھی یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی کوئی بات ہمارے سروں کے اوپر ہی سے گزرتی چلی جا رہی ہے اور ہم سے متعلق نہیں ہے' دوسری طرف چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کے کسی نابغہ فرد کو' کسی علامہ اقبال کو اس درجہ possess کرتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ مجھے اگر کہیں کوئی تشفی میسر آئی ہے' میری علمی پیاس کے لئے اگر کہیں کوئی تسکین کا سامان میسر آیا ہے تو صرف قرآن مجید میں! یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ وہ بات کرتا ہے تو اس انداز میں کہ جو قوم اس کی اوّلین مخاطب تھی گویا اسی سے بات ہو رہی ہے' لیکن اسی کے بین السطور میں اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی اور بڑے سے بڑے فہیم و دانا انسان کی عقلی اور فکری رہنمائی کے لئے اپنے اندر پورا سامان لئے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس رکوع کے بعض پہلوؤں کی طرف بعد میں توجہ دلائی جائے گی۔

نوعِ انسانی کے لئے ایمان کی دعوت

اس تمہید کے بعد آب آیئے کہ پہلے اس کی ابتدائی چار آیات' جن کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں' غور کریں۔ فرمایا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ

النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾ (الحج : ۷۳ - ۷۶)

ان آیاتِ مبارکہ کا ایک رواں ترجمہ یہ ہو گا :

"اے لوگو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے توجّہ سے سنو! یقیناً وہ ہستیاں کہ جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اس پر قادر نہیں ہیں کہ کسی مکھی تک کو تخلیق کر سکیں' خواہ وہ اس کے لئے مل جل کر کوشش کریں۔ اور اگر کوئی مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ تو اس سے اس کو واپس لینے پر بھی قادر نہیں۔ کتنا ضعیف' کتنا لاچار ہے وہ جو طالب ہے' جو چاہ رہا ہے' اور کتنا کمزور اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے' جو مطلوب ہے۔ انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا۔ یقیناً اللہ قوی ہے' زبردست ہے۔ اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اللہ تعالیٰ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔ جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ کہ ان کے پیچھے ہے' اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹا دیئے جائیں گے۔"

یہ ہیں وہ چار آیات جن میں سے پہلی دو آیات میں توحید اور اس کے مقابل کی گمراہی یعنی شرک کا بیان ہے۔ احقاقِ توحید اور ابطالِ شرک کے بعد ایک آیت میں نبوّت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم بحث وارد ہوئی ہے۔ اور آخری آیت معاد سے متعلق ہے' یعنی جزا و سزائے آخرت۔

اب یہاں دیکھئے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو بُت پرست ہیں' اصنام پرستی ان کا دین و مذہب ہے' پتھر کی مورتیوں کے سامنے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں' سجدے کر رہے ہیں' گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے کہا گیا : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ ﴾ "اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے"۔ یہ وہی لفظ ہے جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہمارے ہاں "ضرب المثل" کے نام سے مستعمل ہے۔ ﴿ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ﴾ تو اسے توجہ سے سنو۔ "سَمِعَ یَسْمَعُ" کے معنی ہوتے ہیں سننا اور "اِسْتَمَعَ یَسْتَمِعُ" کے معنی ہوں گے توجّہ سے سننا' کان لگا کر سننا' دھیان سے سننا۔ چنانچہ یہی لفظ آیا ہے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں : ﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا ﴾ یعنی جب

قرآن پڑھا جارہا ہو تو پوری توجہ اور دھیان کے ساتھ اسے سنو اور خاموش رہو۔ تو یہاں فرمایا : ذرا توجہ سے سنو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اُس عمل کی جو تم کر رہے ہو۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ "بے شک یہ جنہیں تم پکار رہے ہو اللہ کو چھوڑ کر"۔ جن سے دعائیں کر رہے ہو' جن کے سامنے نذریں پیش کر رہے ہو' جن کے لئے چڑھاوے چڑھا رہے ہو۔ ﴿ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ﴾ "یہ اس پر بھی قادر نہیں ہیں کہ ایک مکھی تک کی تخلیق کر سکیں' اگرچہ یہ سب جمع ہو جائیں"۔ ﴿ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ﴾ "اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ وہ چیز اُس سے چھڑا نہیں سکتے"۔ یعنی تخلیق تو کیا کریں گے' اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اس سے چھڑانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان حلووں مانڈوں پر اور ان چڑھاووں پر کہ جو تم نے ان کے سامنے رکھے ہیں' اگر مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو یہ ان کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ "کمزور ہے چاہنے والا اور جسے چاہا جاتا ہے"۔ یعنی کیا ہی ضعیف ولاچار اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جارہا ہے' جو مطلوب ہے۔ اور اسی سے اندازہ کرو کہ کتنا لاچار اور بے بس ہے وہ جو اسے چاہ رہا ہے' جو ایسے مطلوب کا طالب بنا ہے۔

معبودانِ باطل کی بے بسی

اب پہلے ذرا اس پر توجّہ کیجئے کہ اس مثال سے اگرچہ بظاہر ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ جتنے اہتمام کے ساتھ بات شروع کی گئی تھی کوئی ویسی بڑی بات تو سامنے نہیں آئی' یہ تو آنکھوں کے سامنے کی بات تھی' وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بُت جو ہیں یہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' یہ بُت مکھیوں کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں' پھر ادھر توجّہ دلانا چہ معنی دارد؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اصنام پرستی یا بُت پرستی کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے' ان کے نظریات کا معاملہ کچھ اور ہے' لیکن عوام الناس میں جو بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ یہی ہے کہ یہی ہیں ہمارے معبود' یہی ہیں ہماری دعاؤں کے سننے والے اور یہی ہیں ہماری مشکل کشائی اور حاجت روائی پر قادر۔ یہ مثال عوام کے اس خیال کو توڑنے کے لئے دی گئی ہے۔

اسی غرض کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عملی تدبیر اختیار کی تھی کہ بت کدے میں گھس کر تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور ایک بڑے بت کے کاندھے پر وہ تیشہ لٹکا دیا کہ جس سے ان تمام چھوٹے بتوں کو توڑا تھا۔ جب لوگوں کو خبر ہوئی تو ایک زلزلہ آ گیا' ایک طوفان برپا ہو گیا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ اور جب یہ کہا گیا کہ ہاں' ایک سرپھرا نوجوان ہے' ابراہیم' وہ ان کی توہین کیا کرتا ہے' ان کے بارے میں کچھ ایسی ویسی باتیں کرتا رہتا ہے تو انہیں پکڑ کر لایا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تم نے کیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے پوچھو جس کے کاندھے پر تیشہ موجود ہے' اس نے کیا ہو گا۔ واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) تو اسی کے خلاف جاتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ تم جانتے ہو وہ نہ بول سکتے ہیں' نہ حرکت کر سکتے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ چوٹ لگائی: ﴿ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ "تف ہے تم پر اور ان پر کہ جنہیں تم پوجتے ہو"۔ جن کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' کچھ سنتے نہیں' کچھ بولتے نہیں' انہیں پوج رہے ہو! اس پر ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے ایک دم پردہ ساہٹ گیا۔ قرآن مجید ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے: ﴿ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ﴾ انہوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا۔ یہ حقیقت ایک لحظہ کے لئے ان کے سامنے منکشف ہوئی کہ سچ بات وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کہی' ہم ہی مغالطے میں ہیں' ہم کسی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں' لیکن پھر انہوں نے اپنی اُس قومی حمیت' اُس عصبیت جاہلیہ کو مجتمع کیا اور اپنی پوری قوتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف بروئے کار لے آئے۔ یہاں بھی اسی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ذرا سوچو' غور کرو' یہ ہاتھ ہلانے پر قادر نہیں' یہ سب مل جل کر بھی چاہیں تو ایک مکھی تک تخلیق نہیں کر سکتے۔ ان کو پوج رہے ہو' ان سے مرادیں مانگ رہے ہو' ان کے سامنے گڑگڑا رہے ہو؟

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہ تو ہوا اس شرک کا ابطال جو اُس وقت اس معاشرے میں بالفعل موجود تھا۔ اب جو ٹکرا آیا ہے ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمتِ قرآنی کا ایک

بہت بڑا خزانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین الفاظ کی ترکیب سے قرآن مجید نے نوعِ انسانی کے لئے ایک بہت بڑی بنیادی رہنمائی فراہم کر دی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں نمبروار اپنے ذہن میں رکھنا مفید رہے گا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق وہی انسان ہے جس کا کوئی نہ کوئی ہدف، کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی آدرش، کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہے۔ اگر انسان بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ حیوان کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ زندگی برائے زندگی کا نظریہ انسان کے لئے نہیں، یہ صورت بالفعل حیوانات کے لئے ہے۔ وہ اپنے حیوانی داعیات کے تحت زندہ ہیں۔ انسان ان سے مقصد برآری کرتا ہے، انہیں اپنے کام میں لاتا ہے، لیکن ان کا اپنا کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ انسانوں میں سے بھی جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں وہ قرآن مجید کے الفاظ میں : ﴿ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ "وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔ انسان وہی قرار پائے گا جس کا کوئی مقصد اور نصب العین معین ہو، جس کے لئے وہ محنت اور جدّوجُہد کر رہا ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر مقصد اور نصب العین اعلیٰ ہے تو اس کے لئے جدّوجُہد کر کے انسان خود بھی ایک بلند تر اور اعلیٰ تر شخصیت کی تعمیر کر سکے گا۔ کسی رفیع الشان اور بلند نصب العین کے لئے جدّوجہد کر کے اسے خود بھی ترفّع حاصل ہو گا۔ لیکن اگر مقصد پست ہے، آئیڈیل پست ہے تو انسان خود بھی پستی کا مکین رہے گا۔ اس کی اپنی شخصیت بھی پستی ہی کی جانب مائل رہے گی۔ اس کی اپنی سیرت و کردار کی کسی اعلیٰ سطح پر تعمیر ممکن نہ ہو گی۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کسی اونچی فصیل پر چڑھنے کے لئے آپ کو ایک کمند دے دی جائے تو آپ کو پہلے وہ کمند پھینکنا ہو گی۔ اس کمند کے پھینکنے کا دارومدار آپ کی قوتِ بازو پر ہے۔ آپ اسے جتنا اونچا پھینک سکیں گے اتنا ہی اونچا پھر آپ چڑھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ پھر بھی چڑھنا آپ کو اپنی محنت سے ہو گا، لیکن اس کمند کو اونچا پھینک کر آپ نے اپنے اونچا چڑھنے کا امکان پیدا کر لیا۔ اور اگر کمند ہی کہیں نیچے

اٹک کر رہ گئی تو ظاہر ہے کہ آپ اگر اس پر چڑھیں گے بھی تو صرف اتنی ہی بلندی تک پہنچ سکیں گے جہاں تک کہ وہ کمند جا سکی۔ چنانچہ اگر آپ کا آدرش' آپ کا نصب العین ارفع و بلند ہے تو آپ خود بھی رفعت اور بلندی تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور اگر آدرش اور نصب العین ہی پست ہے تو اس سے ایک پست شخصیت اور پست سیرت و کردار ہی وجود میں آئے گا۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے صرف اپنی ذات ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے' بقول جگر مراد آبادی ؏ "اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!" وہ اپنے ہی حریمِ ذات کے گرد چکر لگا رہا ہے تو یہ شخص انتہائی خود غرض اور کٹھور دل ہو گا۔ اس شخص کے اندر سے تمام محاسنِ اخلاق نکلتے چلے جائیں گے۔ اس سے بلند تر نصب العین ہو گا اُس شخص کا جو اپنی قوم کو یا اپنے وطن کو اپنا آئیڈیل بنائے' اس کے لئے محنتیں کرے' اس کے لئے جد و جہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نسبتاً بلند تر نصب العین کے لئے جدّ و جہد کرنے والا شخص خود بھی نسبتاً ایک بہتر شخصیت کا مالک ہو گا۔ اس میں اپنی قوم کے لئے ایثار اور قربانی کا مادہ ہو گا۔ وہ اپنی قوم کو اپنی ذات سے مقدّم رکھے گا۔ اس کے سینے میں ایک وسعت ہو گی اور اس کی سوچ کے اندر بھی ایک وسعت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک بلند تر شخصیت ہے جو اس پہلے نصب العین یعنی صرف اپنی ذات یا شخص پرستی یا خود پرستی کے مقابلے میں قوم پرستی یا وطن پرستی کے نصب العین سے وجود میں آئے گی۔ اس سے بلند تر نصب العین انسان دوستی کا نصب العین ہے۔ یعنی قوم و وطن کے امتیاز کے بغیر انسان کی خدمت' انسان سے محبّت۔ یہ یقیناً پہلے دو سے اعلیٰ تر اور بلند تر نصب العین ہے۔ اس کی بنا پر ایک اعلیٰ تر اور عمدہ تر شخصیت وجود میں آئے گی۔

یزداں بکمند آور.....

لیکن تمام آدرشوں' تمام نصب العینوں اور تمام آئیڈیلز میں بلند ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہے۔ اس کو علامہ اقبال کہتے ہیں ؏ "منزلِ ما کبریاست" میری منزل مقصود اللہ کی ذات سے کم کہیں نہیں ہے۔ اسی کو علامہ نے تشبیہہ کے انداز میں

وہی لفظ کمند استعمال کر کے یوں کہا ہے ع "یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ!" انسان کے نصب العین اور ہدف ہونے کا مقام و مرتبہ سوائے خدا کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ وہی انسان کا مقصود ہو' وہی مطلوب ہو' وہی محبوب ہو۔ اب یہ بلند ترین نصب العین' بلند ترین آئیڈیل' بلند ترین آدرش اختیار کرنے کے نتیجے میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت وجود میں آئے گی۔ جس کا آدرش خدا پرستی ہو' جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو' جس کا مطلوب و محبوب خود اللہ ہو اس کی اپنی شخصیت بتمام و کمال کیا ہوگی۔ اس کے لئے آپ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا نقشہ ذہن میں لائیے۔ اس نصب العین سے سینہ اتنا کشادہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کُل مخلوق کے لئے جس کے اندر وسعت اور گنجائش ہو' نہ صرف انسان بلکہ حیوانات تک کے لئے شفقت و محبت ہو۔ رَحْمَۃٌ لِلعَالَمِین ہونے کی کیفیت درحقیقت اُس شخص ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو صحیح معنی میں خدا کا پرستار ہو' جس نے خدا کی بندگی کا حق ادا کر دیا ہو' خدا ہی اس کا مطلوب و محبوب ہو گیا ہو۔ وہ الفاظ یاد کیجئے کہ جو آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک پر اس دنیا سے رحلت کے وقت بار بار آئے : "اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیقِ الْاَعْلٰی" یعنی بس ایک اللہ ہی مطلوب و مقصود ہے اور اب اُسی کی طرف مراجعت کے لئے طبیعت بے چین ہے۔ مطلوب کمزور اور ضعیف ہے تو طالب بھی کمزور اور ضعیف ہوگا۔ مطلوب کا مقام و مرتبہ اعلیٰ اور بلند ہو تو اس کے طالب کو بھی ترفع حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

شرک : اللہ کی قدر کے فقدان کا نتیجہ

فرمایا : ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ﴾ "انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا"۔ ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان کی یہ کمندان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھ کر کیوں رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان خدا کے جمال و جلال کا کوئی اندازہ نہ کر پایا جیسا کہ اُسے کرنا چاہیئے تھا۔ اگر وہ اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک دیکھ پاتا' اس کے مرتبہ کمال کا کہیں کسی انداز میں عُشرِ عشیر ہی کوئی تصوّر کر پاتا تو یہ دنیا و مافیہا اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئی ہوتی۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی کو اپنا مقصود اور آئیڈیل نہ بناتا بلکہ

واقعتاً اس کا مطلوب حقیقی' اس کا مقصودِ اصلی صرف ذاتِ باری تعالیٰ بن جاتی۔ یہ اگر ہوا ہے تو اس لئے ہوا ہے کہ انسان کی نگاہیں دنیا میں الجھی ہوئی ہیں۔ علّامہ اقبال نے جو مکالمہ لکھا ہے عقاب اور چیونٹی کے درمیان اور اس میں عقاب سے یہ کہلوایا ہے کہ ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

اس کے مصداق انسان کی توجّہات پستی کی طرف ہیں۔ انسان جو پستی کا مکین ہے اس نے اِن پست اشیاء ہی کو اپنا مطلوب و مقصود بنالیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کے جلال و جمال' اس کے کمال' اس کے حسن کا کوئی تصوّر نہ کرسکا۔ اس نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ اللہ بذاتہٖ قوی ہے' اللہ بذاتہٖ عزیز ہے۔ وہ القویّ ہے اور العزیز ہے۔ اصل میں اشارہ کیا جارہا ہے کہ شرک جب بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے فقدان یا اس کی کمی کے باعث ہوگا۔ اگر اللہ کو پہچان لیا جائے جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے تو شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کون ہے جو گھٹیا کو اعلیٰ کے مقابلے میں قبول کرے گا۔ چونکہ وہ اعلیٰ اس کے سامنے آیا نہیں' اس کا وہ کوئی تصور کر نہیں پایا' اُس کی کوئی جھلک اُس نے دیکھی نہیں ہے' اس لئے وہ عاشق بنا پھرتا ہے اس ادنیٰ کا۔ اگر کہیں اُس اعلیٰ کی کوئی جھلک اُس نے دیکھ لی ہوتی تو یہ دنیا و مافیہا اس کے لئے ہیچ ہو جاتی۔

اب آپ ذرا اس کا تجزیہ کیجئے۔ جاہلیتِ قدیمہ کا شرک یہ تھا کہ خدا کے تصور اور خدا کی معرفت کی کمی کی وجہ سے انسان نے خدا کو اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپا۔ اس نے سمجھا کہ خدا ایک بڑا بادشاہ ہے' تو بادشاہ کیلئے بھی تو شہزادے شہزادیاں ہونے چاہئیں۔ بادشاہ کو بھی تو اولاد کی طلب ہوتی ہے کہ کوئی اس کا وارث ہو۔ لہٰذا اس کے لئے بیٹے یا بیٹیاں تجویز کر دیئے گئے۔ پھر یہ کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی آخر کچھ اعیانِ مملکت اور نائبینِ سلطنت ہوتے ہیں' اس کی حکومت کا تخت انہی کے بل پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے لئے بھی انہوں نے کچھ نائبینِ سلطنت تجویز کر لئے اور ان کو بھی کچھ اختیارات دے دیئے گئے کہ یہ فلاں کا دیوتا ہے اور یہ فلاں کی دیوی ہے۔ یہ آگ کا دیوتا ہے' یہ پانی کا دیوتا ہے اور یہ دولت کی دیوی ہے۔ اس طور سے خدائی اختیارات کی تقسیم کر دی

گئی۔ یا یہ کہ بڑے سے بڑے انسان اور بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی کچھ ایسے مقربینِ بارگاہ اور مصاحبینِ خاص ہوتے ہیں جن کی بات وہ ٹالا نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ کے بھی کچھ ایسے دوست ہیں کہ ان کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔ اگر وہ سفارش کر دیں تو بس بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تصورات ہیں جو انسان نے خدا کو خود اپنے پیمانوں پر ناپ کر قائم کئے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دِگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ جو ایک مکالمہ علامہ اقبال نے ایک بُت تراش اور اس کے تراشے ہوئے بُت کے مابین پیش کیا ہے' اس میں بُت یہ کہتا ہے کہ تُو تو مجھے خدا بنانے چلا تھا اور بنایا کیا ہے؟ اپنے دو ہاتھ دیکھے تو میرے بھی دو ہاتھ بنا دیئے۔ تُو نے مجھے اپنی ہی صورت پر' اپنی ہی شکل پر ڈھال دیا ہے ؎

مرا بر صورتِ خویش آفریدی!
برونِ خویش تن آخر چہ دیدی؟

تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تیرے سامنے تو اپنا ہی وجود ہے۔ تو خدا کو جب انسان اپنے پیمانوں پر اور اپنے وجود کے مطابق ڈھال کر دیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں شرک کا ایک انبار اور طومار وجود میں آجاتا ہے۔

اِس وقت کا شرک بھی در حقیقت خدا کی معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ خدا پرستی کی بجائے وطن پرستی' قوم پرستی' خود پرستی' مفاد پرستی ـــــ یہ ساری چیزیں کیوں ہیں؟ اس لئے کہ انسان اپنے خول سے باہر نکل کر اللہ کے حسن و جمال کا کوئی مشاہدہ نہ کر پایا۔ اگر کہیں انسان اس کی کوئی جھلک دیکھ پاتا تو یہ تمام چیزیں ہیچ ہو جاتیں اور ان میں سے کسی کو اس کے مطلوب و مقصود ہونے کی حیثیت حاصل نہ رہتی اور "منزلِ ما کبریاست" کے مصداق ذاتِ باری تعالیٰ ہی اس کا مطلوب و محبوب اور منتہائے مقصود ہوتی۔ اب اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ یہی کہ اللہ کی معرفت کی روشنی کو عام کیا جائے' خدا کی پہچان لوگوں میں عام کی جائے۔ اگر انسان خدا کو پہچان لے اور اللہ کی قدر کسی درجے میں کر سکے جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے' اور اگر اس کی قوتوں' اس کی توانائیوں' اس کے اختیارات'

اس کے صفاتِ کمال اور اس کے حسن و جمال کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی کر پائے تو ممکن نہیں ہے کہ پھر وہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی طرف متوجّہ ہو اور کسی اور کو اپنے قلب کے سنگھاسن پر محبوب و مطلوب کا درجہ دے کر بٹھائے۔ تو یہ ہے شرک کا اصل سبب اور یہ ہے اس کے سدباب کی واحد کوشش۔ یہ ہے وہ توحید اور شرک کا فلسفہ کہ جو ان دو آیات میں انتہائی جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔

نبوّت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزوِ اوّل کی تیسری آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا : ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ لفظ "اِصطَفٰی" صفی سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چُن لینا' پسند کر لینا' to choose۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے' پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلئے! رُسل جمع ہے رسول کی۔ اور اَرْسَلَ۔ يُرْسِلُ۔ اِرْسَالًا کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا' فرستادہ' پیغامبر' سفیر' ایلچی ـــــ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہو گا "اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی!" یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوّت و رسالت کی اصل غرض و غایت

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ نبوت و رسالت یا وحی کی اصل غرض و غایت کیا ہے! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے؟ ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لئے رسول بھیجے گئے اور وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجئے : قطعِ عذر اور اتمامِ حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا' رسالت کا' وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے : ﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ

وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ "رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشّر اور نذیر بنا کر' تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے"۔ ان کے پاس اپنی غلط روی کے لئے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ ایک طرف اللہ کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ "لطیف" بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین' اسفل سافلین' ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ○ ﴾ ـــــ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لئے حکمتِ خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (links) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک' پہلی کڑی ہے رسولِ ملک' یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے۔ اپنی اس نورانیت کی وجہ سے یہ مخلوقِ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے۔ فرشتہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مَرد کو' ایک چُنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں اور اس بناء پر ان کے مابین ایک اتّصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ ملک نے وہ پیغام اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہو گا اور عملاً بھی ہو گا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا' انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اِس کا ایک نمونہ بھی پیش کر کے حجّت قائم کر دے گا کہ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (theoretical) شے نہیں ہے' یہ کوئی ناقابلِ عمل پیغام نہیں ہے' بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لئے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ : ﴿ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ﴾۔ انبیاء و رُسل کی پوری شخصیت نوعِ انسانی کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ ہوتی ہے کہ اپنے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحی الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھادیں اور اس کا

ایک عملی نمونہ پیش کر دیں' تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لئے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوت و رسالت کی اصل غرض و غایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ بظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیۂ بر میں' جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا' ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا : ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ اسی طرح حدیث جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ "اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ" تو نبی اکرم ﷺ کی جانب سے جواب یہی دیا گیا کہ ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ.....اِلَى الْاٰخِرِ)) معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفۂ قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی۔ اس دور میں سرسید احمد خاں کو اس طبقۂ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخّص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبی ﷺ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عنصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستان بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سرسید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدّومد کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اگرچہ مصرعِ ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے' یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق

سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے ان کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انہوں نے بیک بینی و دوگوش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

ذہن میں رکھئے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل ملکی حالت میں دو بار دیکھا ہے۔ اِس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متّصل نہ ہوں' ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو وہ روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے' یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایت جبرئیل علیہ السلام پہنچی محمد ﷺ تک اور پھر نبی اکرم ﷺ نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتّصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضور ﷺ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے : ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ کہ "حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تھا افقِ مبین پر! اسی طور سے سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے : ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ ﴾ کہ حضرت جبرئیل کو اصل ملکی صورت میں آنحضور ﷺ نے دوسری بار شبِ معرج میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ ملک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسولِ بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرّسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے : ﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ "وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے"۔ لیکن یہ جاننا کس لئے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۔ "بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے"۔ تمام معاملات آخری فیصلے کے لئے اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو جواب دہی کے لئے وہاں حاضر ہونا ہو گا۔

یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویا لُبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (سورۃ الحج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے' لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" کے خطاب سے ہوا ہے۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں ان میں شرک کا ابطال' توحید کا اثبات' شرک کا اصل سبب ۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ۔ شرک کا انسان کی سیرت و کردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفّع حاصل کرتے ہیں' پھر نبوّت و رسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ ملک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں۔

اہلِ ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں' ان پر ایمان لا چکے ہوں۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ کے الفاظ سے۔ "اے اہلِ ایمان!" یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو' جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو' جو ایمان لے آئے رسالت پر' آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کرنا کیا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے' تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ـــــ آپ دیکھیں گے اس مقام پر دو آیتوں میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اور پے بہ پے فعل امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ○ ﴾

(الحج: ۷۷، ۷۸)

"اے اہل ایمان! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو' اور نیک کام کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے' اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ اُس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی' تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ! (اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ!) وہ تمہارا حامی ہے' (مددگار ہے' پشت پناہ ہے۔) تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی!"

پہلا تقاضا: ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجئے۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لئے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لائیے جس کے چار قدمچے (steps) ہوں۔ دیکھئے' کسی بھی مدّعیٔ ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ ارکانِ اسلام کی' شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے۔ ان میں اوّلین فریضہ' کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے ـــــ اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلٰوةُ ـــــ نماز ہے۔ یہ عِمَادُ الدِّيْنِ' یعنی دین کا ستون ہے۔ ارکانِ اسلام میں سے رُکنِ رکین یہی نماز ہے۔ اس

آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد در حقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندہ ہو گئی تمام ارکانِ اسلام کی۔ اس لئے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے۔ لہٰذا مطالبات دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکان اسلام کی پابندی پر۔

دوسرا تقاضا : عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے' رب کی پرستش' اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کُلی پوری زندگی میں درکار ہے۔ یہ اطاعت بلاچون وچرا ہونی چاہیئے اور بلا استثناء بھی! زندگی کو حصّوں اور اجزاء میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں پر اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعتِ کُلّی مطلوب ہے جو محبّتِ خداوندی کے جذبے سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور در حقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے رب کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج سب اسی لئے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! یہ دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا : بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیہ مبارکہ میں ﴿ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو' بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لئے' پوری نوعِ انسانی کے لئے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھئے' ایک درجہ وہ ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصوّر کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں' یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے' اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں' کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے' کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا

جائے۔ اسی طرح یتیموں' بیواؤں' مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہو گا۔ آیۂ بِر میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ﴾

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

لیکن غور کیجئے گا۔ خدمت خلق ہی کی ایک بلند تر سطح اور بھی ہے' وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا' وہ کہ جن کی زندگی کا رخ غلط ہو گیا ہے' جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں' جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کود جانا چاہتے ہیں' ان کو سیدھی راہ پر لانا' خلقِ خدا کو راہ ہدایت کی طرف دعوت دینا' اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں! اس لئے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہوا' اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمت خلق کا کام تو نہ ہوا۔ اگر کسی کی کوئی وقتی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی دی درآنحالیکہ آپ کو یقین ہے' اگر واقعتاً آپ کی آنکھیں کھل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہوا تھا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ "اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے!" اور حضور ﷺ کا وہ طرزِ عمل کہ ((یَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) "اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے"۔ اور ((یَا صَفِیَّةُ عَمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) "اے اللہ کے رسول (ﷺ) کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو آگ سے بچا

لے" کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کو گویا جہنم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر جب تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل بتمام و کمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبر گیری ہے' مسکینوں کی خدمت ہے' مسافروں کی مہمان نوازی ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضور ﷺ کی سیرت میں موجود تھیں۔ لیکن پھر جب آپؐ کے پاس وہ "الحق" آگیا' ہدایتِ خداوندی نازل ہو گئی' جب آپؐ پر حقائق منکشف کر دیئے گئے' جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی نگاہوں پر روشن کر دیئے گئے' آپؐ کی ساری مساعی' ساری تگ و دو' ساری دوڑ دھوپ اور خدمت خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہو گیا اسی پر کہ خلق خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دیں' راہ ہدایت کی طرف بلائیں' نیند کے ماتوں کو جگائیں' جو لوگ مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں' بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ "لَعَلَّ" کے اصل معنی ہوتے ہیں "شاید" ـــــ ترجمہ یوں ہو گا "شاید کہ تم فلاح پاؤ" اور یہ "شاید" کا لفظ جب شاہانہ انداز میں کلامِ الٰہی میں آتا ہے تو اس میں حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' جیسے کوئی بادشاہ اگر کسی سے کہے کہ اگر تم یہ کرو تو شاید ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ کریں' تو درحقیقت یہاں یہ "شاید" ایک مکمل وعدے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تو فرمایا "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح سے ہم کنار ہو گے۔ یہ کرو گے تو کامیابی حاصل کر سکو گے۔

"اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!"

معلوم ہوا کہ اب ہم پھر اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے کہ ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا سورۃ العصر اپنے جملہ مضامین کے ساتھ پھر ہمارے سامنے آگئی۔ اس لئے کہ وہاں نجات کی شرطِ اوّل تھی ایمان' یہاں خطاب ہوا ہے ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا ﴾ "اے اہلِ ایمان!" کے الفاظ سے۔ وہاں ایمان کے فوراً بعد ﴿ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کی شرط مذکور تھی۔ یہاں اسی عملِ صالح نے ﴿ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ کے الفاظ میں چار اوامر کی شکل اختیار کرلی۔ "رکوع کرو، سجدہ کرو، بندگی کرو اپنے رب کی اور تمہارا عمل خیر پر مبنی ہو جائے"۔ البتہ "وَافْعَلُوا الْخَيْرَ" کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لیجئے جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ)) کہ لوگوں میں بہتر وہی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہو، جس سے لوگوں کو نفع پہنچ رہا ہو۔ اب ظاہر بات ہے کہ نفع صرف دنیا کا نفع ہی تو نہیں ہے۔ یہ نفع کا نہایت محدود تصور ہے۔ اور اگر فی الواقع آنکھیں کھل گئی ہوں، حقیقت منکشف ہو گئی ہو، آخرت کا علم انسان کو حاصل ہو گیا ہو، تو اب "نفع" کا مفہوم بدل جائے گا۔ اب انسان کو نظر آئے گا کہ اصل نفع تو آخرت کا نفع ہے۔ اصل جیت وہاں کی جیت اور اصل ہار وہاں کی ہار ہے۔ سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے: ﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ "وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن"۔ جو اُس روز نفع میں رہا وہ حقیقتاً نفع میں رہا اور جو اُس روز گھاٹے میں قرار دیا گیا وہی ہے اصل میں گھاٹا پانے والا!

فلاح کا دارومدار دینی فرائض کی ادائیگی پر ہے!

اس آیۂ مبارکہ پر پھر اپنی توجہ کو مرکوز کیجئے! ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ "اے اہلِ ایمان! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو (اُس کی اطاعت کُلی پر کاربند ہو جاؤ، اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر) اور بھلے کام کرو، (نیکیاں کرو، خلقِ خدا کی خدمت کرو) یہ سب کام کرو گے تو فلاح پاؤ گے! آپ غور کیجئے کہ اگر صرف دعوائے ایمان سے فلاح اور کامیابی کا حصول یقینی ہو جائے تو کیا یہ سارا کلام، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ مہمل نہیں قرار پائے گا؟ یہ بے معنی بات ہو گی۔ یہ منطق کی اصطلاح میں تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ جو چیز محض دعوائے ایمان سے یا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے خود بخود حاصل ہو جائے اس کے لئے اتنا کھکھیڑ مول لینا، اتنی محنت اور مشقت کرنا سعیٔ لاحاصل قرار پائے

گا۔ پھر یہ رکوع و سجود' بندگیٔ رب' پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعتِ کُلّی اور خدمتِ خلق پر کمربستہ ہو جانا گویا یہ سب اضافی چیز قرار پائیں گے! لیکن قرآن حکیم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العصر میں یہ بات وضاحت سے سامنے آئی تھی کہ نجات کی شرائط چار ہیں! ﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾

چوتھا تقاضا : جہاد فی سبیل اللہ

ایمان اور عمل صالح کی حد تک بحث تو سورۃ الحج کی اس ایک آیت میں مکمل ہو گئی جس کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر کے قائم مقام کے طور پر' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے حوالے سے اب اصطلاح آ رہی ہے یہاں جہاد کی۔ چنانچہ دوسری آیت جو اس رکوع کی آخری آیت ہے' پوری کی پوری جہاد ہی کے موضوع پر ہے۔ فرمایا : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کا حق ہے''۔ آپ دیکھیں گے کہ اس رکوع کے پہلے اور دوسرے حصّے کے مابین مضامین کے اعتبار سے بڑا گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے ہمارے اس منتخب نصاب میں اب جہاد ہی کا مضمون چل رہا تھا لیکن اس آخری آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس پورے رکوع کا مضمون سامنے آ جائے۔

رکوع کے دونوں حصّوں کا تقابل کیجئے! اوپر لفظ آیا تھا ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ کہ انہوں نے خدا کو نہ پہچانا جیسے کہ پہچاننا چاہیئے تھا۔ وہ اللہ کے مقام و مرتبہ اور اُس کی صفاتِ جمال و کمال کا کوئی اندازہ نہ کر پائے جیسا کہ اس کے اندازے کا حق تھا۔ وہی اسلوب یہاں آ رہا ہے : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ ۔ یہ دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں : (۱) خدا کی معرفت جیسا کہ اس کا حق ہے' اور (۲) خدا کے لئے جہاد' کوشش' جدّوجُہد اور محنت جیسا کہ اس کا حق ہے۔ پہلی چیز ایمان کا لُبِّ لباب اور ایمان کا اصل حاصل ہے۔ انسان کی نظری و فکری و عملی قوتوں کی معراج ہے اللہ کی معرفت!

اور انسان کے قوائے عملیہ کا جو بہترین ہدف اور ان کا بہترین مصرف ہے وہ ہے جہاد فی اللہ 'یعنی اللہ کے لئے جہاد۔ درحقیقت "فی اللہ" سے مراد بھی کم و بیش وہی ہے جو "فی سبیل اللہ" سے ہے 'جس پر مفصّل گفتگو پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ آیت کے الفاظ پر توجّہ کو جمائیے! ﴿ وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ اور محنتیں کرو' کوششیں کرو' جدّوجُہد کرو' لگاؤ اس راہ میں اپنی جانیں اور اپنے مال اور کھپاؤ اپنی جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں اور صرف کرو اپنے اوقات اس طور سے اور اس شان سے کہ جس شان سے اللہ کے لئے محنت کرنے کا حق ہے۔

یہاں ذہن میں رکھئے کہ انسان محنتیں کرتا ہے' مشقتیں بھی کرتا ہے' لیکن یہ مسئلہ کہ اس کی محنت اور مشقت پر کس کا کتنا حق ہے' اس کی صحیح تعیین ہی پر دارومدار ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا۔ ہم میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو گویا کہ ہمہ تن کھپا دیتے (invest کر دیتے) ہیں اپنی اولاد پر۔ بلکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ بات شاید غلط نہ ہو گی جو ایک صاحب نے بڑے عجیب پیرائے میں ایک زمانے میں مجھ سے کہی تھی کہ میں تو اپنی بیوی بچوں کا ملازم ہوں کپڑے اور روٹی پر! میری ساری محنت صرف ہوتی ہے کمانے پر۔ اور اس کمائی کا مصرف کیا ہے؟ میرے یہ گھر والے' ان کی ضروریات' ان کا پیٹ پالنا' ان کا تن ڈھانپنا اور بس! یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمارے ننانوے فیصد لوگوں کی سعی و جہد' ان کی بھاگ دوڑ' ان کی محنت کا اصل حاصل اس کے سوا کچھ نہیں! سوال یہ ہے کہ انسان اگر اپنے اہل و عیال کے لئے محنتیں اور مشقتیں کر رہا ہے تو وہ اہل و عیال آخر اس کو کیا repay کر سکیں گے؟ اس کی اس محنت اور جدّوجُہد کی کیا قیمت ادا کر سکیں گے؟ اسے اس کا کیا بدلہ دے سکیں گے؟ اکثر و بیشتر تو وہی اولاد انسان کے بڑھاپے کے وقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ الفاظ بھی زبان سے نکلتے ہیں کہ ابا جان! آپ پرانے زمانے کے لوگ ہیں' آپ کو کیا معلوم کہ جدید زمانے کے تقاضے کیا ہیں! اس وقت جس طرح کلیجہ اندر سے کٹتا ہے کہ یہ ہیں وہ کہ جن پر ہم نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا تھا' لگا دیا تھا اور کھپا دیا تھا! چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ تم سوچو کہ تمہاری محنت و مشقت اور تمہاری

سعی و جہد کا اصل حق دار کون ہے؟ کیا وہی نہیں جو تمہارا خالق ہے' تمہارا مالک ہے' تمہارا پروردگار ہے' تمہارا پالنہار ہے اور تمہارا رازق ہے! اگر واقعتاً تم نے اسے پہچان لیا ہے' اگر یہ تمہارا اقرار لسانی محض ایک عقیدہ نہیں ہے جو زبان پر ہو' بلکہ اس کی حقیقت بھی کسی درجے میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور تمہارے دل و دماغ اس حقیقت سے منور ہو چکے ہیں تو اس کا تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلنا چاہئے' وہ یہ کہ تمہاری سعی و جُہد کا اولین ہدف اور تمہاری قوتوں اور توانائیوں کا اولین مصرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی قرار پانا چاہئے۔ اور تمہاری قوتوں اور صلاحیتوں کا بہتر اور بیشتر حصہ لگنا چاہئے اور کھپنا چاہئے اللہ کے لئے! اسی کا نام ہے جہاد فی اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ! اس طور سے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ یہ نہ ہو کہ معمولی سی کوشش یا تھوڑی سی محنت کر کے اور ذرا سا ایثار یا تھوڑا سا وقت لگا کر یا کچھ تھوڑا سا کہیں چندہ دے کر انسان اپنے دل کو مطمئن کر بیٹھے کہ میں نے حق ادا کر دیا' میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی' اللہ کے لئے جتنا کچھ مجھے کرنا چاہئے تھا وہ میں نے کر دیا! یہاں "حَقَّ جِهَادِهٖ" کے الفاظ بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے اس عمل کو جس شدّ و مد کے ساتھ اور جس وسعت کے ساتھ ہونا چاہئے اور زندگی میں اس کو جس درجے اہمیت' جو مقام اور مرتبہ ملنا چاہئے' اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ابھی یہ مضمون جاری رہے گا ــــــ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یعنی شہادت علی النّاس درحقیقت اس آخری آیت کا اصل مضمون ہے' جس کے پیش نظر اس مقام کو منتخب نصاب کے اس حصّے میں شامل کیا گیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰؑ --- علیّ مرتضیٰؓ

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن

عدم برداشت کا قومی و بین الاقوامی رجحان اور تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

تحریر : عبدالماجد ☆

دُنیا کے تمام ظلم و ستم، قتل و غارت، فتنہ و فساد اور جنگ و جدال کی بنیادی وجہ عدم برداشت ہے۔ عدم برداشت کی وجہ سے بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے، گھر اُجڑ جاتے ہیں، اقوام آپس میں لڑتی ہیں، ایک ملک دوسرے پر حملہ کرکے ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

یہ بے صبری اور عدم برداشت ہی ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں مختلف نسلی، لسانی، مسلکی اور مذہبی گروہ اور جماعتیں آپس میں دست و گریباں ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں پر ہندوؤں کا تشدد اور عیسائیوں اور ہندوؤں کی باہمی چپقلش ہے، کوسوو میں سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہے، کشمیر میں بھارتی فوجیوں کی بربریت اور فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم ہیں۔ یہ عدم برداشت ہی ہے جس کی وجہ سے روس نے افغانستان میں کئی سال جنگ کرکے سولہ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا خون بہایا اور امریکہ نے عراقی عوام پر بیالیس دنوں کی خلیجی جنگ کے دوران اٹھاسی ہزار ٹن سے زیادہ گولہ بارود گرا کر ہیروشیما کی تباہی کا ریکارڈ توڑ دیا۔ [1] اور خود امریکہ کے سابقہ اٹارنی جنرل ریمزے کلارک (Ramsey Clark) کے مطابق خلیجی جنگ کے دوران اور مابعد کے پانچ سالوں میں پانچ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے اور یونیسیف (UNICEF) کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر کے جو بچے ہلاک ہوئے ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس بے رحمی، سفاکی اور انسانیت سوز مظالم پر ریمزے کلارک بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :

☆ اسسٹنٹ پروفیسر زوآلوجی، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، مانسہرہ

"That is crime against humanity of enormous magnitude"[۲]

(یعنی انسانیت کے خلاف یہ ایک بہت بڑا جرم ہے)

یہ دوسروں کو برداشت نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اس وقت پوری دُنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے اور تہذیبی ٹکراؤ کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ عدم برداشت کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں۔

❶ عدم برداشت کے اسباب (Causes of Intolerance)

۱) نسلی، لونی، لسانی، وطنی اور قومی برتری کا احساس۔

۲) دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش، یعنی حُبِّ تفوّق (Urge to dominate)

۳) عدل وانصاف کا فوری نہ ملنا۔

۴) استحصالی نظاموں کی وجہ سے غربت، بے روزگاری اور احساسِ محرومی وغیرہ کا موجود ہونا۔

۵) اخلاقی اور مذہبی تعلیمات پر عمل نہ ہونا۔

۶) مذہبی برتری کا احساس اور اپنے نظریات و معتقدات کو دوسروں پر مسلّط کرنے کی کوشش کرنا۔

① حیاتیات، نفسیات اور بشریات کے ماہرین (Biologists, Psychologists and Anthro pologists) لمبی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر بچہ فطرتی طور پر معصوم پیدا ہوتا ہے۔ اس کی جبلت (Instinct) میں دوسرے انسانوں کے ساتھ کسی قسم کی رقابت یا تعصب نہیں ہوتا۔ بعد میں ماحول (Environment) اس کے اندر مختلف قسم کے تعصّبات اور احساسات پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ بعض لوگوں کے لئے محبت کے جذبات پیدا کرلیتا ہے اور بعض کے لئے نفرت کے۔[۳]

(۲) اسی طرح یہ بات بھی تحقیق سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رنگ، نسل، وطن اور

قوم کے حوالے سے کسی انسان کی فطرت میں کوئی تعصّب اور تفوّق کا جذبہ نہیں پایا جاتا' بعد میں والدین اور ماحول اسے ان چیزوں پر فخر و غرور کرنا سکھاتے ہیں' نتیجتاً وہ دوسروں کو کم تر سمجھنے لگتا ہے اور یوں انسانوں کے اندر "من دیگرم تو دیگری" کے احساس کے تحت ایک دوسرے سے ٹکراؤ اور تصادم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ (۴)

(۳) استحصالی نظاموں کی موجودگی کی وجہ سے تمام افراد اور اقوام کو انصاف نہیں ملتا یا دیر سے ملتا ہے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام میں احساس محرومی (Sense of deprivation) اور قنوطیت (Frustration) پیدا ہوتی ہے' جو کہ مختلف معاشی و معاشرتی ناہمواریوں کو جنم دے کر آپس میں ٹکراؤ کی کیفیات کو جنم دیتی ہیں۔ (۵) اسی طرح ظلم اور عدم مساوات بھی معاشرے میں فساد کا سبب بنتے ہیں۔

(۵) صرف مادی و سائنسی ترقی اور مجرد قانون معاشرے کے مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو درست نہیں کر سکتے' بلکہ اس کے لئے افراد کے اندر اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انقلاب ضروری ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اپنے مضمون "تاریخ جدید انسان کو متنبہ کر رہی ہے" میں لکھتے ہیں کہ :

> "ہمارے مسائل کا حل سائنسی تجربہ گاہوں میں نہیں مل سکتا۔ ہمارے مسائل اخلاقی ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آ چکے ہیں"۔

آخر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبیعی ایمان کا احیاء ہے"۔ (۶)

(۶) مذہبی بنیادوں پر بھی انسانوں کے درمیان کشیدگی رہی ہے' وہ اس وجہ سے نہیں کہ مذہب یہ سکھاتا ہے' بلکہ اس وجہ سے کہ جب کوئی قوم یا فرد یہ تصور کرتے ہوئے کہ حق اس کے پاس ہے' اور حق کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے دوسروں پر مسلط کیا جائے' اگر مخاطب نہ مانے تو اس پر تشدد کیا جائے اور اس سے بزور منوایا جائے۔ مذہب کے معاملے میں یہ ذہنیت آپس میں ٹکراؤ بلکہ جنگوں کو جنم دیتی ہے۔ ایسا کئی بار تاریخ میں ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔

عدم برداشت کے مذکورہ بالا اسباب کو ختم کرنے کے لئے اس وقت تک دنیا میں کوئی نظام مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ عالمی لیول پر سوشلزم کا بھی تجربہ ہو چکا' سرمایہ دارانہ نظام بھی آزمایا جا چکا' مغربی جمہوری نظام کے ثمرات کا بھی دنیا مشاہدہ کر چکی ہے اور موجودہ مغربی تہذیب اور نیو ورلڈ آرڈر کے نتائج بھی سب کے سامنے ہیں۔ اب صرف ایک ہی نظام رہتا ہے اور وہ ہے رحمۃٌ لِلعالمین حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا "دین اسلام" جس کے بارے میں دنیا کے تمام دانش وروں اور انسانیت کے بہی خواہوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ایسے وقت میں' جبکہ اسلحہ کی قوت یا اقتصادی غلبہ کے نفرت انگیز دباؤ سے نسل انسانی اپنی پیاری آزادیاں گنواتی ہوئی معلوم ہوتی ہے' اسلام ہی مستقبل میں انسانیت کی آزادی کے قلعے کا آخری پشتہ ہے اور عالمی سیاست کی تنظیم نو کے لئے حقیقی طور پر بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے[۷]۔ دراصل مسلمان ایسی قوم کے افراد ہیں جن کے پاس عالمی برداری کو دینے کے لئے ایک واضح اور مثبت شے ہے۔[۸]

❷ صبر و برداشت کے لئے اسلامی اصول و تصورات

اسلام کی عطا کردہ تعلیمات صبر و برداشت کی بنیاد نہ تو چند مخصوص مشترک مادی اغراض پر ہے' اور نہ ہی ہنگامی و عارضی حالات نے انہیں جنم دیا ہے اور نہ ان میں کسی خاص قوم یا ملک کی سیاسی یا معاشی بہبود پوشیدہ ہے' بلکہ ان کا واضع یعنی رب العالمین وہ ہستی ہے جو تمام انسانوں کا خالق ہے اور وہ ان کی نفسیات سے کماحقہٗ واقف ہے۔ اس لئے اس نے ان تعلیمات کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ ہر انسان میں "زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے" کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہیں۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں' وہ انسان کے دل و دماغ اور طرزِ عمل میں تنگ نظری کی بجائے وسیع النظری اور محدودیت کی بجائے آفاقیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ نسلی' لونی' وطنی' قومی اور طبقاتی منافرت کو مٹا کر عالمی اخوت و انسانی مساوات کا سبق دیتی ہیں۔ یہ تمام انسانوں کو اللہ کا کنبہ قرار دے کر یہ باور کراتی ہیں کہ بہترین وہ ہے جو خدا کے کنبے کے ساتھ ہمدردی اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے۔ پھر اس کے ساتھ یہ تعلیمات ایسی اخلاقی و قانونی ضمانتیں بھی عطا

کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنایا جائے تو مذہب و مسلک کے اختلاف کے باوجود ان کے ذریعے قومی و بین الاقوامی سطح پر صبر و برداشت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور امن و بھائی چارے کی فضا عام ہوتی ہے۔

آیئے حضور ﷺ کی عطا کردہ تعلیمات صبر و برداشت کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیسے وہ تعلیمات انسانوں کے اندر دوسروں کو برداشت کرنے کے جذبات پیدا کرتی ہیں اور ان تمام وجوہات کا کیسے خاتمہ کرتی ہیں جو نسلِ انسانی میں بغض و عناد اور تصادم کا باعث بنتی ہیں۔

① وحدتِ انسانیت کا تصوّر :

انسانیت پر اسلام کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے وحدتِ انسانیت کا ایسا تصور دیا جو رنگ و نسل، لسانیت اور وطنیت کے تمام بُتوں کو پاش پاش کر کے بھائی چارے کی مشترکہ اساس فراہم کرتا ہے۔ وہ انسانوں کے ذہن میں یہ بات راسخ کرتا ہے کہ جس طرح سارے انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں اسی طرح وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور ان سب میں ایک ہی ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد مختلف رنگ و روپ، مختلف قوت و صلاحیت اور مختلف عقل و ضمیر کے باوجود حقوق میں برابر ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے مساویانہ سلوک کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے اختلافات اور رنجشوں کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں برابر شریک ہوتے ہیں اسی طرح تمام دنیا کے انسانوں کو فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ایسا ہی بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مرورِ زمانہ اور اختلافِ ماحول کی وجہ سے اگرچہ وقتی طور پر رنگ و زبان میں فرق آجاتا ہے، لیکن بنیاد سب کی ایک ہے، یعنی تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انہیں مٹی سے بنایا گیا تھا۔ قرآن نے انسانوں کو یہ بتایا کہ وہ معرفت و شناخت کی آسانی کے لئے خاندان اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم رکھ سکتے ہیں، مگر انہیں کسی طرح بھی عزت و ذلت اور برتری و کمتری کا معیار نہیں بنا سکتے، عزّت و ذلّت اور برتری و کمتری کا معیار صرف ایک ہے اور

وہ ہے تقویٰ اور پرہیز گاری والی زندگی۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ صدق سے کئی مواقع پر بے جا انسانی تفریق اور مصنوعی تفاخر کو مٹانے کے لئے نہایت بلیغ اور مؤثر خطبے نکلے ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا :

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ اسی طرح سرخ و سفید رنگ والے کو کسی سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کو کسی سرخ و سفید رنگ والے پر کوئی فوقیت نہیں۔"(۹)

نیز فرمایا :

﴿ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا ﴾ (۱۰)

"اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ)) (۱۱)

"ساری مخلوق خدا کی کفالت میں ہے (اُس کے کنبہ کی طرح ہے) تو وہ شخص اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوگا جو اس کی عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے گا"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مصنوعی امتیازات (Artificial discrimination) کو مٹانے کے لئے صرف خطبوں پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ آپؐ نے ان تعلیمات کو "مواخاۃ" اور میثاقِ مدینہ کی شکل میں عملی طور پر نافذ کر کے دکھایا۔ اس وقت تمام دُنیا میں ذات پات اور رنگ و نسل کی وجہ سے جو تفریق اور فساد موجود ہے اس کا واحد علاج تعلیماتِ نبویؐ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت سترہ لاکھ سے زیادہ افراد قید خانوں اور جیلوں میں بند ہیں' جن میں ساٹھ فی صد سے زیادہ قومیتوں یا نسلی اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور آدھے سے زیادہ سیاہ فام ہیں۔(۱۲) اور اسی طرح کی ایک تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ کسی سفید فام کی نسبت سیاہ فام کو سزائے موت کے امکانات پندرہ فی صد زیادہ ہیں اور یہ کہ نسلی' علاقی اور معاشی حیثیت اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ کون سزائے موت پائے گا اور کون نہیں۔(۱۳)

② عصبیت کا خاتمہ :

حضور اکرم ﷺ نے صرف مثبت طور پر بھائی چارے اور مساوات کی تعلیم نہیں دی بلکہ منفی طور پر ہر طرح کی تنگ نظری اور عصبیتوں کا خاتمہ کیا' تاکہ نسل انسانی عصبیتوں کی وجہ سے عدم برداشت کا شکار نہ ہو۔ آپؐ نے عصبیتِ جاہلیہ کو رد کرتے ہوئے فرمایا :

((مَامِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصْبِيَّةٍ ' لَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصْبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰی عَصْبِيَّةٍ))

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو تعصب کی دعوت دے' وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں (مسلمان نہیں) جو عصبیت کی وجہ سے کسی سے لڑے' اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر مرے"۔

کسی صحابی نے پوچھا کہ عصبیت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

((اَنْ تُعِينَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ)) (۱۴)

"(عصبیت یہ ہے) کہ تو ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے"۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ :

((اَنْ يَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهٗ عَلَى الظُّلْمِ)) (۱۵)

"(عصبیت یہ ہے) کہ آدمی ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے"۔

پاکستان میں مختلف لسانی' نسلی اور صوبائی عصبیتوں کا خاتمہ صرف حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی سے ممکن ہے۔

③ تحمل و برداشت کے لئے اخلاقی تعلیمات

اسلام اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انسان کے دل و دماغ میں ہمہ گیری پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کے داخل و خارج کو سنوار کر اس کی قوتِ برداشت بڑھاتا ہے۔ اسلام اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انسان کے دل میں خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کا یقین پیدا کر کے اسے عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ اسلامی اخلاقیات کی ایک طویل فہرست ہے' ان میں سے چند اہم عنوانات یہ ہیں : برائی کے مقابلے میں نیکی کرنا' بدی کو معاف کرنا'

عفو و درگزر سے کام لینا' رحم و کرم کرنا' غُصّہ کو پی جانا' نرمی سے بات کرنا' معاملات میں بھی رفق و لطف کا اظہار کرنا' صلح پسندی' انسانی برادری کے ساتھ نیک سلوک کرنا' جانوروں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرنا' دشمنوں کو معاف کرنا۔

ان تعلیمات میں کہیں بھی تنگ نظری کا شائبہ نظر نہیں آتا' بلکہ جس طرح ربُّ العالمین کی ربوبیت ساری مخلوق کے لئے عام ہے اسی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیمات بھی ہمہ گیر ہیں' دوست دشمن سب اس میں برابر ہیں۔ پھر اسلامی شریعت نے صرف محاسن اخلاق ہی کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان رذائل سے بھی سختی سے منع کیا جو انسانی تعلقات کے بگاڑ اور فساد کا موجب بنتے ہیں' جیسے جھوٹ بولنا' فخر و غرور کرنا' کسی کو بلاوجہ برا کہنا' بے ایمانی اور بدعہدی کرنا' فساد برپا کرنا' دوسروں کی حق تلفی کرنا' بدگمانی کرنا' کسی کو پیدائشی یا نسلی طور پر ذلیل سمجھنا' تمسخر اڑانا' معاملات میں بددیانتی کرنا وغیرہ۔ ان رذائل سے نہ صرف روکا گیا ہے بلکہ دُنیا و آخرت میں ان کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے اور آخرت میں ناکامی کا سبب بتایا گیا ہے۔

ان تمام اخلاقی تعلیمات میں سے چند محاسن و رذائل کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

① برائی کے مقابلے میں بھلائی کرنا :

قرآن میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

﴿ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ○ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ○ ﴾ (حٰمٓ السجدة : ۳۴'۳۵)

"بھلائی اور برائی برابر نہیں۔ تم برائی کا جواب اچھائی سے دو' پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی ایسا ہو جائے گا جیسے دوست قرابت والا۔ اور یہ بات انہی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں' اور یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب و قسمت والا ہوتا ہے"۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

﴿ وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ○ ﴾ (الرعد : ۲۲)

"وہ برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں' ان کے لئے آخرت کا اچھا انجام ہے"۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اوّل الذکر آیت کی شرح ان الفاظ میں کی ہے :

((اَمَرَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ بِالصَّبْرِ عِنْدَالْغَضَبِ وَالْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ وَالْعَفْوِ عِنْدَالْاَسَاءَةِ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنَ الشَّيْطٰنِ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوَّهُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ)) (۱۶)

"اللہ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے کہ غُصّہ کے وقت صبر کا' جہالت کے وقت برداشت کا اور برائی کے وقت معافی کا معاملہ کریں۔ جب ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں شیطان سے محفوظ کر دے گا اور ان کے دشمن کو ان کے لئے جھکا دے گا گویا کہ وہ قریبی دوست ہو"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ' اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيْثَ)) (۱۷)

"اللہ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں ختم کرتا' بلکہ برائی کو بھلائی سے مٹاتا ہے۔ یقیناً بُری چیز کبھی بُری چیز کو نہیں مٹاتی"۔

اور یہ بھی ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے :

((صِلْ مَنْ قَطَعَكَ' وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ' وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ)) (۱۸)

"اُس سے صلہ رحمی کرو جو تم سے قطع تعلق کرے' اور اس سے درگزر کرو جو تم سے زیادتی کرے' اور اس سے بھلائی کرو جو تم سے برائی کا معاملہ کرے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی صبر و برداشت اور بُرائی کے مقابلے میں بھلائی کرنے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

فتح مکّہ کے دن جب بعض صحابہؓ نے یہ نعرہ لگایا کہ آج کشت و خون کا دن ہے' آج دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا دن ہے' تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ" کی آواز سنی تو فرمایا ((اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ)) "آج رحم و کرم کا دن ہے" اور اپنے جانی

دشمنوں کو فرمایا: ((اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) "جاؤ! تم لوگ تمام سزاؤں سے بَری ہو"۔

عثمان بن طلحہ، جو اس سے پہلے کعبہ کے کلید بردار تھے، ان سے کنجی اپنے دستِ مبارک میں لے کر پھر واپس کر دی اور فرمایا :

((اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْبِرِّ وَ الْوَفَاءِ)) (۲۰)

"آج کا دن نیکی اور وفاشعاری کا دن ہے"۔

خیبر میں آپ ﷺ نے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا، چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل سے درگزر کیا اور ان کے کلیجے کو چبانے والی عورت ہندہ کو معاف کیا۔ طائف والوں نے آپؐ پر پتھروں کی بارش کر کے لہولہان کر دیا، لیکن آپؐ نے ان کے حق میں رحمت و ہدایت کی دعا کی، احد میں اپنے چہرے کو زخمی کرنے والوں کے حق میں دعاء خیر کی اور دشمنوں کے حق میں بد دعا کے لئے کہا گیا تو فرمایا کہ میں دُنیا میں لعنت کے لئے نہیں بلکہ رحمت کے لئے آیا ہوں۔ (۲۱) آج مسلمانوں کو ایسی تعلیمات کو اپنانے کی انتہائی ضرورت ہے۔

② رفق ولطف :

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملات اور بات چیت میں سختی اور درشتی سے کام نہ لیا جائے، بلکہ نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ تحمل اور نرمی کی اہمیت قرآن و احادیث میں بڑی شد و مد سے بیان کی گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی نرم دلی کو اللہ نے اپنی رحمت قرار دیا ہے اور فرمایا کہ :

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

(آل عمران : ۱۵۹)

"اگر آپؐ سخت دل اور سخت مزاج ہوتے تو لوگ آپؐ سے تتر بتر ہو جاتے"۔

فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ اللہ تعالیٰ نرم و مہربان ہے اور نرمی و مہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا ہے۔ نرمی جس چیز میں ہو تو اس کو زینت دے گی اور جس چیز سے بھی اُٹھ جائے گی اس کو بدنما اور عیب دار بنا دے گی۔

((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ)) (۲۲)

"جو شخص نرمی سے خالی ہو گیا وہ ہر بھلائی سے خالی ہو گیا"۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اُس شخص پر آگ کو حرام قرار دیا جو لوگوں کے قریب ہو اور نرم خو اور آسان ہو۔ (۲۳)

③ غیظ و غضب کی جگہ حلم و بردباری :

غیظ و غضب اور غُصّہ ایک سَلبی اخلاقی قدر اور مذموم و ناپسندیدہ فعل ہے' کیونکہ اس کی وجہ سے بہت سے ظالمانہ اور بے دردی کے کام انسان سے سرزد ہو جاتے ہیں' جن پر بعد میں اکثر پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے' اس لئے تعلیماتِ نبوی' میں غُصّہ کو قابو کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ ایک اچھّے مسلمان کی قرآن نے یہ تعریف بیان کی ہے :

﴿ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ ﴾ (آل عمران : ۱۳۴)

"اور وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں"۔

دوسری جگہ ہے :

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾ (الشوریٰ : ۳۷)

"اور جب ان کو غُصّہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں"۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ کسی شخص نے عرض کیا : اَوْصِنِیْ "مجھے وصیت فرمائیں" آپ ﷺ نے فرمایا ((لَا تَغْضَبْ)) "غُصّہ نہ کر" (یعنی برداشت کر)۔ اس شخص نے بار بار عرض کیا' مگر آپؐ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ غُصّہ نہ کر۔ (۲۴)

لوگ عموماً غُصّہ نکالنے یا کسی سے انتقام لینے کو بہادری سمجھتے ہیں' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا : ((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ' اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ)) (۲۵) یعنی زور آور اور پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے' بلکہ وہ ہے جو غُصّہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود انتقام نہیں لیتا' بلکہ معاف کر دیتا ہے' اللہ اس کو اپنے سب بندوں سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ (۲۶)

یہ درست ہے کہ غُصّہ پینے میں تلخ گھونٹ ہے' لیکن اس کی تلخی میں جو حلاوت ہے

اور اس کے پینے میں جو خیر و برکت ہے وہ کسی اور مشروب میں نہیں۔ آپؐ نے فرمایا : "اللہ کی رضا کے لئے غصے کے گھونٹ کو پینا سب سے افضل گھونٹ ہے"۔ غُصّہ ایک نفسیاتی مرض ہے جو ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے : ((اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ)) یعنی غُصّہ ایمان کو ایسے خراب کر دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔ (۲۷)

اس میں شک نہیں کہ غُصّہ ایک جبلی تقاضا ہے' لیکن اس پر قابو رکھنے سے انسان دنیا و آخرت میں مصائب و عذاب سے بچ جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جو شخص اپنی زبان کو بند رکھتا ہے اللہ اس کے عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور جس نے اپنے غصے کو روکا اللہ قیامت کے دن اس کو عذاب سے بچائے گا"۔ ایک حدیث میں ہے ((لَا تَغْضَبْ وَ لَكَ الْجَنَّةُ)) "غُصّہ نہ کر' تیرے لئے جنّت ہے"۔ (۲۸)

قرآن عظیم میں ۹۰ سے زیادہ بار صبر کا ذکر ہے اور ۱۶ مقامات پر صبر و برداشت کا حکم ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے۔ (۲۹)

ان تمام تعلیمات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعے غُصّہ و عدم برداشت کو ختم کرنے کے لئے کتنی ترغیبات دی ہیں' کیونکہ اللہ کے رسولؐ جانتے تھے کہ غُصّہ ہی اصل میں تمام بُرائیوں کی بنیاد ہے اور صبر و تحمل ایک اعلیٰ ترین حفاظتی تدبیر ہے' اس تدبیر کے ذریعے انسان فساد کے ہر بم کو "defuse" (ناکارہ) کر سکتا ہے اور دُنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

(جاری ہے)

حواشی و حوالہ جات

(۱) *Ramsey Clark; Impact International (Vol: 25, No.9 Sep., 1995)*

بحوالہ ماہنامہ میثاق اکتوبر ۱۹۹۸ء' مدیر ڈاکٹر اسرار احمد' مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور' ص ۵۸

(۲) *Ibid* (ایضاً) *p59*

(۳) *Ruch, F.L; Psychology and Life (Scott, Foresman and*

company, Newyork, P 680= Enough has been said throughout this book on the way that social attitudes are acquired through learning to indicate the falsity of the "Instinct hypothesis of race prejudice" If race prejudice were an inborn human characteristic, it would be found in all groups (of human), but it is not so.....

یہ بات مغرب والے آج کہہ رہے ہیں' لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل دُنیا کو یہ بتایا تھا کہ ہر بچہ بغیر کسی تعصب و رقابت کے فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ ((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةٍ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) اور قرآن کی سورۃ الروم کی آیت ۳۰ ﴿ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ سے بھی بات واضح ہوتی ہے۔

(۴) *Ibid* (ایضاً) *P674, Psychology of Racial conflict*

اور اسی کتاب کا صفحہ ۶۸۹' جہاں پر مصنف کتاب ہذا لکھتا ہے :

"War is not the result of man's "aggressive instinct" but of habits, attitudes of beliefs that he has acquired as a result of social conditioning".....

صفحہ ۶۸۷ پر یہی مصنف لکھتا ہے :

Children whose parents allow them to play with children of different ethnic groups, with no fuss or special comment accept them just as people and are not likely to grow up feelings that there are unbridgeable gaps between different groups of mankind.

(۵) احساس محرومی اور قنوطیت کے بارے میں بھی ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ یہ تشدد اور ٹکراؤ کو جنم دیتے ہیں۔

When unable to get what they want, people behave aggressively, the aggression being directed not necessarily against the source of frustration but against any person or group who happens to be convenient and visible..... p 681-682 حوالہ بالا

اسی طرح ٹلی نے ۱۹۶۹ء میں لکھا :

Historically, collective violence has flowed regularly out of

the central political processes of western countires. Men seeking to seize, hold or realign the levers of power has continually engaged in collective violence as a part of their struggle. The oppressed have struck in the name of justice, the privileged in the name of order those in between in the name of fear (Psychology and Life by Zambardo 9th edition, 1975, P 624.

اس وضاحت اور حوالوں کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ عدم برداشت کے اسباب ربّ العالمین نے انسان کی فطرت میں نہیں ڈالے' بلکہ بعد میں والدین اور ماحول اسے یہ چیزیں سکھاتے ہیں۔ اس لئے اگر انسان کی آسمانی تعلیمات کے ذریعے صحیح رہنمائی کی جائے تو عدم برداشت کے تمام اسباب ختم ہو کر یہاں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔

(۶) پروفیسر خورشید احمد = اسلامی نظریہ حیات' ص ۱۰۱' ۱۰۲

اسی طرح کے خیالات کا اظہار سابق امریکی صدر نکس نے اپنی کتاب "Beyond Peace" (ورائے امن) میں تفصیل سے کیا ہے :

"ہمارے شہروں کو گھن لگا ہوا ہے اور اس کی سڑاند ہمارے روحانی' اخلاقی اور تہذیبی عادات و اطوار میں رچ بس چکی ہے' جس سے غربت' جرائم اور دیگر عوامی سہولتوں کے ناجائز استعمال جیسے عوارض نے جنم لیا ہے"۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں : "آتش زن' لٹیرے' ڈاکو اور فسادی اس لئے آگ نہیں لگاتے' لوٹتے اور ڈکیتی اور تشدد کرتے کہ وہ غریب ہیں' بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ تہذیبی اعتبار سے گل سڑ گئے ہیں" بحوالہ میثاق (ماہنامہ) اکتوبر ۱۹۹۸ء' ص ۵۰

(۷) رحمان مذنب۔ تہذیب و تمدن اور اسلام --- ۱۹۹۳ء' ص ۳۹۱

(۸) رحمان مذنب۔ تہذیب و تمدن اور اسلام --- ۱۹۹۳ء' ص ۳۹۰

(۹) مسند احمد' بحوالہ سیرت النبیؐ۔ شبلی نعمانی' سید سلیمان ندوی' مکتبہ مدنیہ لاہور' ج ۲' ص ۹۳

(۱۰) بخاری شریف' بحوالہ سیرت النبیؐ' شبلی نعمانی' سید سلیمان ندوی' مکتبہ مدنیہ لاہور ج ۶' ص ۱۶۱

(۱۱) الحدیث' بحوالہ اسلامی ثقافت' ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

(۱۲) روزنامہ مشرق' ۱۶ مارچ ۱۹۹۹ء' مضمون "امریکہ میں انسانی حقوق کی حالت زار"

مشرق سروس
(۱۳) روزنامہ نوائے وقت، ۲۲ مارچ ۱۹۹۹ء، مضمون "حقوق انسانی کا تحفظ اور امریکہ" محمد آصف شیخ
(۱۴) ابوداؤد، بحوالہ اربعین نووی، مولفہ امام یحییٰ بن شرف الدین النووی، نعمانی کتب خانہ اردو بازار، لاہور
(۱۵) ابن ماجہ، بحوالہ ۱۴
(۱۶) ابن کثیر، ج ۴، ص ۱۰۱۔ قدیمی کتب خانہ، اردو بازار، کراچی
(۱۷) مشکوٰۃ، الجزء الثانی، ص ۸۴۵ بحوالہ کاروانِ حیات۔ مولانا وحید الدین خان۔ فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار، کراچی، ص ۱۵۸
(۱۸) الحدیث، بحوالہ معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، مکتبہ دارالعلوم کورنگی، کراچی، ج ۲، ص ۱۹۰
(۱۹) مولانا مجیب اللہ ندوی، اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصوارت، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۶۴
(۲۰) ایضاً۔
(۲۱) سارے واقعات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: سیرت النبیؐ شبلی نعمانی ج ۴
(۲۲) مشکوٰۃ المصابیح۔ الجزء الثالث، بحوالہ کاروان ملت، ص ۱۵۹
(۲۳) ترمذی، بحوالہ سیرت النبیؐ، ج ۶، ص ۲۳۷
(۲۴) بخاری شریف، بحوالہ اربعین نووی، ص ۱۱۴
(۲۵) بخاری و مسلم، بحوالہ اربعین نووی، ص ۱۱۵
(۲۶) الحدیث
(۲۷) بیہقی، بحوالہ مظاہر حق
(۲۸) اربعین نووی، ص ۱۱۷
(۲۹) قاضی سلمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین۔ پروگریسو بک سنٹر، اردو بازار، لاہور، ج ۳، ص ۳۴۱

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

تحریر : عبدالرشید عراقی

۳۱ / دسمبر ۱۹۹۹ء کو عالم اسلام کے نامور عالمِ دین مفکّرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۸۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مولانا علی میاں کے سانحہ ارتحال سے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ بڑی خوبیوں کے حامل انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جملہ متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نہ صرف برّصغیر (پاک و ہند) بلکہ عالم اسلام کے ممتاز عالمِ دین، مفکرِ اسلام، صاحبِ نظر، عربی ادب کے مایہ ناز ادیب، غیر معمولی طور پر معاملہ فہم اور صاحب فہم و فراست تھے۔ مولانا علی میاں ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی نامور عالم دین، طبیب حاذق اور بلند پایہ مصنف تھے۔ ان کی کتاب نزہتہ الخواطر (عربی) بہت مشہور تصنیف ہے، جس میں تقریباً چار ہزار اساطین علم و فن کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا حکیم سید عبدالحی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم بھی رہے۔ آپ کا انتقال ۱۵ / جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ کو ہوا۔

مولانا علی میاں نے اپنے بزرگوں کی روایات کو پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رکھا اور ان کو جِلا دی۔ چنانچہ آپ نے ایک عرصہ تک نہایت ممتاز مدرّس کی حیثیت سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں خدمات انجام دیں اور پھر ایک عرصہ تک دار العلوم ندوہ کے نائب ناظم اور بعد میں ناظم کی حیثیت سے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

مولانا علی میاں نے نصف صدی سے زائد قوم و ملّت اور دینِ اسلام کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں۔ آپ کے انتقال سے ملّتِ اسلامیہ کا ایک ستون گر گیا اور مسلمانانِ ہند ایک

عظیم مذہبی رہنما، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم روشن خیال شخصیت سے محروم ہو گئے۔

مولانا علی میاں عالمِ اسلام کے عظیم عالم دین تھے، عالم اسلام میں ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور عالم اسلام کے جیّد علمائے کرام ان کے علمی تبحر کے معترف تھے۔ عالم اسلام کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں آپ تشریف نہ لے گئے ہوں اور وہاں کے ممتاز علمائے کرام آپ سے شناسا نہ ہوں۔

مولانا علی میاں کی زندگی ان کے گوناگوں مشاغل سے معمور رہی۔ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ان علماء میں شمار کئے جاتے تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ وہ بیشتر اسلامی ممالک کی علمی و ادبی انجمنوں کے ممبر تھے۔ برِّ صغیر میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم، دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ کے صدر، مجلس انتظامیہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے صدر اور مسلم پرسنل لاء بورڈ ہند کے صدر تھے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام میں رابطہ عالم اسلامی مکّہ مکرمہ کے نائب صدر، عربی اکیڈمی دمشق کے رکن، جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ کے رکن، رابطہ الادب الاسلامیہ کے صدر، مؤتمر عالم اسلامی بیروت کے رکن، مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا کے رکن، دمشق یونیورسٹی اور مدینہ یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر اور آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے دینی، علمی اور ادبی و قومی انجمنوں اور علمی و سیاسی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جس وقت آنکھ کھولی اُس وقت برِّ صغیر مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور اکابر رجال سے کفِ گل فروش بنا ہوا تھا۔ ان کو بے شمار نامور مذہبی و سیاسی ہستیوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ دہلوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف سے ان کا قریبی رشتہ رہا۔ اس طرح ان کی ذات میں پورے عہد کا خلاصہ جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت بڑی متوازن بن گئی

تھی۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں برپا ہونے والی تحریکات اور اشخاص کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا تھا۔

قدرت کی طرف سے بڑا اچھا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حافظہ بھی بڑا قوی تھا۔ ٹھوس اور قیمتی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا۔ برصغیر کی تمام سیاسی و غیر سیاسی، قومی و ملی اور علمی و دینی تحریکات کے قیام کے پس منظر سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام اور مغربی تحریکات سے بھی انہیں پوری طرح واقفیت تھی اور ان تمام تحریکات سے متعلق اپنی ایک ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔

مولانا علی میاں کو ہندوستان کی طرح پاکستان کی علمی و ادبی انجمنوں اور دینی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے سعودی عرب، انڈونیشیا، شام، عراق، کویت، دوبئی، قطر، مصر، مراکش اور وسط ایشیا کے علاوہ بیشتر مغربی ممالک میں دینی و علمی کانفرنسوں میں متعدد بار شرکت کی تھی اور ہر جگہ اپنے علم و فضل کا اثر چھوڑ کر آئے۔

مولانا علی میاں کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سب کو اجاگر کرنا تو ایک مستقل کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک عالم دین، ایک مفکر، عربی ادب کے نامور ادیب اور ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے پوری دنیا اپنے اندر بسائے ہوئے تھے۔ مولانا ندوی کی ذات خود ایک انجمن تھی اور ایسا بلند مقام اور ایسی بلند و اعلیٰ قابلیت رکھنے والی شخصیتوں میں آخری شمع تھی۔ اب ایسی شخصیت کا پایا جانا صدیوں تک محال و مشکل ہو گا۔ ایسی عظیم المرتبت شخصیات کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر تھے۔ ایک طرف انہوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کی افادیت اور تحفظ کی ضرورت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا اور دوسری طرف حکومت ہند کو مجبور کیا کہ وہ مسلم پرسنل لاء میں مداخلت نہ

کرے۔ ہندوستان کی تمام مسلم تنظیموں اور بے شمار تعلیمی و علمی اور سماجی اداروں میں آپ کی صلاحیتوں' اصابت رائے اور آپ کے دانش مندانہ مشوروں کا اعتراف کیا جاتا تھا اور آپ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

مولانا علی میاں جید عالم دین تھے۔ اخلاق و شرافت' تہذیب و شائستگی' بلند حوصلگی اور وسعت قلب و فکر وغیرہ ایسی پاکیزہ خصوصیات آپ میں پائی جاتی تھیں' جس کی وجہ سے نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی آپ کا ادب و احترام کرتے تھے۔

مولانا علی میاں حق گوئی اور بے باکی میں بھی منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ جب بھی بھارت میں مسلمانوں کے خلاف کوئی یورش برپا ہوتی تو فوراً حکومت کو نشانۂ تنقید بناتے۔ ان کی حق پسندی کو ملک کے سرکاری اور قومی حلقوں میں قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ مولانا علی میاں کا سیاسی رجحان کانگرس کی جانب رہا ہے اور ہمیشہ کانگرس کی کوتاہیوں کی برابر نشاندہی کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس حق گوئی اور صداقت شعاری کو ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ بھارت کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنما مولانا علی میاں کی حق گوئی اور صداقت شعاری کی بناء پر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے علمی مرتبہ و مقام کا برصغیر پاک و ہند کے تمام مکاتب فکر کے علماء کو اعتراف ہے اور مولانا ندوی خود بھی دوسرے مکاتب فکر کے جید علماء کرام کا اعتراف کرتے تھے۔ مولانا علی میاں کے مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے قریبی روابط تھے اور آپ ان دونوں علمائے کرام کے علم و فضل کے معترف تھے۔ مولانا علی میاں اپنے ایک مضمون میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> ''مولانا داؤد غزنوی صاحب عیدین کی نماز منٹو پارک لاہور کے میدان میں پڑھتے تھے۔ ہمارے استاد شیخ مولانا احمد علی صاحب لاہوری بالتزام ان کے پیچھے نماز عیدین ادا کرتے۔ مولانا طلحہ صاحب اور بہت سے ان حضرات کا بھی یہی معمول تھا جو مساجد میں عید کی نماز ادا کرنے پر میدان میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیتے اور اسے اقرب

اِلی السنہ سمجھتے تھے۔ مجھے بھی کئی بار مولانا کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ اردو میں خطبہ بھی دیتے' جو مؤثر اور دلپذیر ہوتا۔

تقسیم کے بعد مَیں ایک مرتبہ لاہور حاضر ہوا تو ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب اور ان کے رفقاء نے ازراہِ محبت جامعہ سلفیہ میں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور اپنی جماعت کے ممتاز لوگوں اور فضلاء ندوہ کو مدعو کیا۔ مَیں حاضر ہوا تو میری حیرت و ندامت کی انتہا نہ رہی کہ مجھے وہاں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا اور مولانا داؤد غزنوی صاحب نے' جو میرے اساتذہ اور بزرگوں کی صف میں تھے' خود پڑھا۔ یہ ان کی بے نفسی اور تواضع کی انتہا تھی اور اس سے اس تعلق کا اندازہ ہو سکتا ہے جو ان کو حضرت سید احمد شہید اور ان کے خاندان اور مسلک سے تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جس سال رابطہ عالم اسلامی کی بنیاد پڑی وہ حج کرنے آئے تھے۔ رابطہ کے پہلے اجلاس میں وہ شریک ہوئے اور اس کے رکن منتخب ہوئے۔ مدینہ طیبہ کے ہوٹل "فندق القسیر" میں ان کی خدمت میں کئی بار حاضری ہوئی اور وہاں ان کو قلبی دورہ پڑا۔ طبّی امداد بروقت پہنچی۔ اللہ نے فضل فرمایا اور وہ بخیریت لاہور واپس ہوئے۔ یہ ان کی آخری زیارت اور ملاقات تھی جو نصیب ہوئی"۔ (پرانے چراغ' جلد ۲' ص ۲۷۸'۲۷۹)

مولانا عطاء اللہ حنیف سے ان کے بہت قریبی مراسم تھے اور یہ دونوں علمائے کرام ایک دوسرے کے علم و فضل کے معترف تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم نے راقم سے کئی بار فرمایا کہ :

"مولانا علی میاں علوم اسلامیہ کے بحرِ زخار ہیں۔ تمام علومِ اسلامیہ پر ان کی نظر وسیع ہے اور عالم اسلام میں ان کی دینی و علمی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا"۔

ایک بار مولانا عطاء اللہ مرحوم سے میں نے کہا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لاہور آئے ہوئے تھے' ان سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں' تو مولانا عطاء اللہ مرحوم نے فرمایا کہ :

"مولانا علی میاں تشریف لائے تھے اور ان سے تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات ہوئی۔ مختلف علمی موضوعات زیر بحث آئے اور جاتے ہوئے فرمایا کہ "میں جب بھی لاہور آتا ہوں تو یہ ارادہ کرتا ہوں کہ آپ سے اور مولانا مودودی سے ضرور ملاقات کروں گا۔" تو میں نے کہا مولانا یہ آپ کا حسن ظن ہے"۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ عربی اور اردو میں آپ نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ آپ کی عربی تصانیف کو عرب دنیا میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ آپ کی کئی ایک کتابیں اسلامی ممالک کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں۔ آپ کی بیشتر کتابوں کے فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے، جن میں مشہور تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے :

تصانیف

① المرتضیٰؒ ② انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ③ ارکانِ اربعہ ④ اصلاحیات ⑤ انسانیت کے محسن اعظم ⑥ اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر ⑦ انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار ⑧ اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین ⑨ پاجا سراغِ زندگی ⑩ پرانے چراغ (۳ جلد) ⑪ تاریخ دعوت و عزیمت (۶ جلد) ⑫ سید احمد شہید (۲ جلد) ⑬ تعمیرِ انسانیت ⑭ تذکرہ مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی ⑮ تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات ⑯ تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب ⑰ جب ایمان کی بہار آئی ⑱ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ⑲ حیاتِ عبدالحی ⑳ حدیث کا بنیادی کردار ㉑ خلفائے اربعہ ㉒ دستور حیات ㉓ دو متضاد تصویریں ㉔ عالم عربی کا المیہ ㉕ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ㉖ قادیانیت ㉗ کاروانِ ایمان و عزیمت ㉘ کاروان مدینہ ㉙ کاروانِ زندگی (۶ جلد) ㉚ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ㉛ منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ㉜ مذہب و تمدن ㉝ نبیِّ رحمت ﷺ (۲ جلد) ㉞ نقوشِ اقبال ㉟ نئی دنیا، امریکہ میں صاف صاف باتیں ㊱ نبی خاتم و دین کامل ㊲ ہندوستانی مسلمان ㊳ سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ ㊴ اسلام کا تعارف ㊵ معرکہ ایمان و مادیت ㊶ بصائر ㊷ حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب ㊸ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔

مستقبل کی قوّت : اسلام یا مغرب؟

تحریر : نعیم احمد خان

بفحوائے الفاظ قرآنی :

﴿ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ○ ﴾ (صٓ : ۷۱، ۷۲)

مادیت و روحانیت کے امتزاجی تسویتی و تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے انسان کی اس کارزارِ حیات میں معاشرت پسند جبلت کے ساتھ نمود ہوئی۔ انسان میں ایک طرف جہاں مادیت و روحانیت (اور نتیجتاً اخلاقیت) کے مختلف پہلو پائے جاتے ہیں، وہیں انفرادیت و اجتماعیت کے متخالف پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ان تمام پہلوؤں کی تشفی کے اپنے اپنے تقاضے ہیں، جن کی معروضی، آفاقی اور کامل مبنی بر حکمت تکمیل و تشفی کا مناسب بندوبست عصر حاضر کے انسان کا وہ سنگین مسئلہ ہے جس کا حل وہ خالق و مالک کائنات، اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام سے ہٹ کر خود تلاش کرنے کی کوششوں میں مسلسل خسارے اور گھاٹے کا شکار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر انسان اپنے لئے کیا طرزِ حیات اور نظامِ زندگی اختیار کرے گا یا اختیار کرنے پر مجبور ہو گا؟ بہرحال جو طرزِ عمل بھی وہ اختیار کرے گا وہی مستقبل کا غالب نظام عالم ہو گا۔

وہ نظامِ حیات خواہ کوئی بھی ہو، یہ امر بہرحال طے شدہ ہے کہ مؤثر و مفید اور دیرپا ہونے کے لئے اسے انسان کے انفرادی یعنی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی یعنی سیاسی سماجی اور اقتصادی (Politico-Socio-Economic) دونوں طرح کے داعیات کی اس طرح تشفی کے مناسب نظام پر مبنی ہونا پڑے گا کہ وہ انسان کے صرف مادی اور حیاتیاتی (Biological) پہلو ہی پر مرتکز نہ ہو بلکہ اس سے قدرے اہم ترین رجحان، روحانیت (اور نتیجتاً اخلاقیت) کی متناسب اور کامل تشفی بھی کر سکے۔ اور جو قوم بھی ایسے

نظام کی حامل ہوگی وہی مستقبل میں اقوامِ عالم کی حکمران ہوگی۔

اسلام یا مغرب

اگرچہ دُنیا میں فی الوقت متعدد نظام ہائے زندگی پیش کئے جا رہے ہیں اور متعدد مذاہب فکر کے لوگ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کے پاس عمدہ طرزِ حیات موجود ہے' تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اب جزئی اختلافات سے ہٹ کر دُنیا میں دو ہی نظام ایسے ہیں جو مستقبل میں دُنیا کے حکمران بن سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ نظریہ ہے جو دراصل متعدد عقلی و انسانی پیش کردہ نظریہ ہائے حیات کا ایک مجموعہ ہے' جس کی علمبردار سابقہ الہامی نظریہ حیات سے منحرف قوم یہود ہے' جسے اصطلاحاً مغربی نظام بھی کہا جا سکتا ہے' اور دوسری طرف وہ نظریۂ حیات ہے جو الہامی (وحی پر مبنی) تعلیمات پر مشتمل ہے اور اسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گویا فی الوقت دُنیا میں مغربی نظام اور اسلام ایسے نظام ہائے فکر و عمل ہیں جو مستقبل میں ہر خاص و عام کے لئے مؤثر اور مفید ہونے کے دعویدار ہیں۔ لیکن اس دعوے میں کونسا نظام فکری اور عملی طور پر کامیاب ہوگا؟ اس کا علم ان دونوں کے پس منظر کے حوالے سے نظریاتی و عملی تجزیئے اور واقعاتی شہادت سے ہی ہو سکتا ہے۔

مغربی نظام کا پس منظر

ہم جس تہذیب اور نظریۂ حیات (بلکہ صحیح تر الفاظ میں نظریہ ہائے حیات) کو "مغربی نظام" کا جامع عنوان دے رہے ہیں یہ دراصل وحی پر مبنی نظریہ حیات سے فرار اور انحراف کا نتیجہ ہے' جس میں "مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" اور "الضَّآلِّيْنَ" کا امتزاجی رجحان نمایاں ہے۔ اس تہذیب اور نظریۂ حیات کا پس منظر بلاشبہ پانچویں صدی عیسوی کے واقعات تک میں تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن اصلاً یہ قرونِ وسطیٰ (Middle Ages) کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک کی پیداوار ہے' جس کے نتیجے میں کلیسا کے مذہبی جبر و تشدد اور استبداد کے ردِ عمل کے طور پر مذہب سے بیزاری اور نتیجتاً خدا سے بیزاری کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کے نتیجے میں حریت پرستی' عقلیت پرستی' انفرادیت پرستی اور انسانیت پرستی جیسے نظریات نے جنم لیا جو لادینیت (Secularism) پر منتج

ہوئے' جس کے تحت انسانی زندگی کی دونوں سطحوں یعنی انفرادیت اور اجتماعیت کی ہم آہنگی اور یک رنگی کو مسترد کرتے ہوئے انہیں الگ الگ قرار دیا گیا کہ انفرادی سطح پر انسان کو بے قید آزادی حاصل رہے' جو چاہے کرتا پھرے اور جو عقیدہ چاہے رکھے۔ البتہ اجتماعی سطح پر بہرحال اسے قومی نظام کے اصول وضوابط کی پابندی کرنا پڑے گی۔

روس کے حصے بخرے ہونے کے بعد جب امریکہ واحد سپرپاور کے طور پر سامنے آیا تو اس نے اس لادینیت (Secularism) کو "نیا عالمی نظام" (New World Order) بنانے کی بھرپور کوشش شروع کر دی' جسے یہودی عالمی نظام یا "نیو ورلڈ آرڈر" بھی کہا جا سکتا ہے' اس لئے کہ امریکہ کو فی الوقت یہودیوں کے آلۂ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہود کی باقاعدہ تاریخ تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں ان پر عروج و زوال کے چار ادوار گزرے۔ کم و بیش پہلی تین صدیاں عروج کی' اس کے بعد تقریباً اتنا ہی عرصہ زوال کا' پھر کم و بیش تین ہی صدیاں عروج کے بعد اب اگرچہ وہ زوال میں ہی ہیں لیکن اپنی منزل' عظیم تر اسرائیل کے قیام کی طرف رواں ہیں۔

اسلام کا پس منظر

اسلام کسی خاص عرصۂ حیاتِ انسانی میں ظاہر نہیں ہوا بلکہ یہ انسان کی حیات کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ تخلیق آدم سے قبل اللہ تعالیٰ نے ارواحِ انسانیہ سے عالمِ ارواح میں اپنے خالق و مالک ہونے کا عہد لیا ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف: ۱۷۲)' جو عہدِ الست کہلاتا ہے' اور انسان کو خیر و شر اور بھلائی و برائی کی تمیز سے بہرہ مند فرما کر اس دنیا میں بھیجا۔ ساتھ ہی یہ اہتمام بھی فرما دیا کہ وقفے وقفے سے انسان کے اس "عہد" کی تذکیر بھی ہوتی رہے اور انسان کو اس کے عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے مطابق اس "عہد" کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس کے مادی و روحانی (اور نتیجتاً اخلاقی) داعیات کی مناسبت سے مناسب احکامات بھی ملتے

رہیں۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو افراد چنے یا منتخب فرمائے وہ نبی اور رسول کہلائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مقدّس فرشتوں کی وساطت سے مختلف احکامات وحی کرتا' جو یہ انبیاء و رسل بلاکم و کاست فکری و عملی سطح پر لوگوں کو پہنچاتے رہے۔

انبیاء و رُسل کا یہ سلسلہ اوّل دن سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نہ صرف اس زمین پر پہلے انسان تھے بلکہ پہلے نبی بھی تھے۔ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ انسان کے عمرانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جاری رہا اور کوئی بھی قوم ایسی نہ رہی کہ جس میں ان انبیاء و رُسل میں سے کسی کی بعثت نہ ہوئی ہو۔ یہ سلسلہ حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوا اور انسانیت کو قیامِ قیامت تک کیلئے وہ ابدی ہدایت نامہ (قرآن مجید) مع ضروری توضیحات (حدیثِ رسولؐ) دے دیا گیا جس میں انسان کیلئے ہر گوشۂ زندگی کے متعلق راہنما اصول موجود ہیں۔ چونکہ انسان عمرانی ارتقاء کی انتہائی منازل کو پہنچ چکا تھا اور اس کے لئے اب مزید ارتقاء کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے اب یہ سلسلہ ختم ہوا۔ تاہم دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری موجودہ امت مسلمہ کو سونپ کر معنوی اعتبار سے یہ سلسلہ جاری رکھا گیا۔

مغربی تہذیب

انسان کی انفرادی سطح حیات میں مغربی نظام پوری آزادی اور مساوات کا قائل ہے اور لینن کے الفاظ میں "ان معنوں میں آزاد ہونے کا مطلب دوسروں کی کسی قسم کی مداخلت سے آزادی ہے"۔ یعنی جو بھی آدمی جو کچھ کرنا چاہے' جس طریقے سے کرنا چاہے اصولاً اُسے اس کے معاملے میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ تو نے فلاں کام کیوں کیا۔ جس کے باعث پوری توجہات خدا کی بجائے کائنات' روح کی بجائے مادہ اور حیاتِ اُخروی کی بجائے حیاتِ دُنیوی پر مرتکز ہو گئیں۔ جس کے نتیجے میں مغربی تہذیب بے قید آزادی' بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو کر رہ گئی۔ نام نہاد مساوات کے دعوؤں کے باوجود نسلی امتیاز کی صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کے ایک ممبر سینٹ کے مطابق :

"کسی سیاہ فام کے لئے جو اپنے دل میں سیاسی مساوات کی آرزو رکھتا ہے امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں کاروبار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلاشبہ یہ ملک صرف سفید

فام کی مملکت ہے اور اسے اس کی ملکیت میں رہنا چاہیئے"۔ (۱)

اور معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ سفید اور سیاہ فام ایک عبادت خانے میں جمع نہیں ہو سکتے' ایک بس میں سوار نہیں ہو سکتے اور ایک ساتھ کھانا تو درکنار ایک ریستوران تک میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ خاندانی نظام شدید بگاڑ کا شکار ہے' طلاق کی شرح روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ اولاد والدین سے بیگانہ ہے اور والدین اولاد سے بے پروا۔ اس صورت حال کا اعتراف خود اہل مغرب بھی کرتے ہیں۔

لندن میں محفل میلاد منعقد کروانے والے ایک مغربی راہنما کے یہ الفاظ کہ "آج کا یورپی انسان اپنے اندر روحانی اور ثقافتی خلاء محسوس کرتا ہے' اس وجہ سے وہ اکثر بے چینیوں اور کرب و اضطراب کی الجھنوں میں اپنے آپ کو گرفتار محسوس کرتا ہے۔ اس روحانی اور ثقافتی خلاء کو پر کرنے کے لئے وہ مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتا ہے (تاکہ) کوئی ایسی تہذیب و ثقافت مل جائے جسے اپنا کر وہ اپنے اس روحانی اور ثقافتی بحران سے نجات حاصل کر سکے۔" اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود اہل مغرب میں قبولِ اسلام کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

مغرب کا اجتماعی نظام

اجتماعی سطح پر مغرب میں متعدد معاشی و سیاسی نظام پیش ہوتے رہے ہیں۔ سیاسی سطح پر تو اب جمہوریت متفق علیہ ہے' جب کہ معاشی سطح پر اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام قابل ذکر حیثیت رکھتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISM)

سادہ الفاظ میں سرمایہ دارانہ نظام سے مراد ایسا معاشی نظام ہے جس میں عام ذاتی برتنے کی اشیاء مثلاً مکان' لباس اور گھریلو ساز و سامان کے علاوہ ذرائع پیداوار مثلاً زمین' کارخانے' دکانیں' مختلف کاروباری ادارے اور ذرائع نقل و حمل وغیرہ بھی نجی یا ذاتی ملکیت ہوتے ہیں جن میں ہر ایک کو پوری طرح آزادانہ طور پر تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کوئی بھی فرد جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے اور آزادانہ طور پر ذاتی نفع کی

خاطر مزید پیداوار حاصل کرے۔

اس نظام میں جو مبالغہ آمیز آزادی کا تصور دیا گیا ہے اس کے تحت پیدا ہونے والی خود غرضی کو محض نظام مقابلہ و مسابقت سے نہیں روکا جا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایسے معاملات میں کوئی واضح قدغن نہ لگائی جائے محض اخلاق کوئی خاص مؤثر رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ جب یہ نظام عمل کی دنیا میں جلوہ گر ہوا تو اجیر و مستاجر کی باہمی سنگدلانہ کشمکش کے ساتھ ہی دنیا واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی اور امیر و غریب کا فرق بڑھتا گیا حتیٰ کہ اب صورت حال یہ ہے کہ اس نظام کے تحت دنیا میں آج :

(۱) صرف ۱۳۵۸ افراد کے پاس ۴۵ فیصد عوام سے زائد دولت جمع ہو گئی ہے اور اس لسٹ میں سلطان آف برونائی اور آغا خان شامل نہیں ہیں۔

(۲) دنیا کی ۱۵ فیصد آبادی کے پاس دنیا کی ۸۵ فیصد دولت اور بقیہ ۸۵ فیصد آبادی کے پاس ۱۵ فیصد دولت ہے۔[۲]

اسی آزادانہ معیشت کے تحت کاروباری حضرات انتہائی پُر مضرت اور مخرب اخلاق اشیاء خوشنما بنا کر فروخت کرتے ہیں اور محض دولت کی خاطر معاشرے کو بگاڑنے سے نہیں کتراتے۔ پھر ایوانِ اقتدار بھی یہی لوگ اپنی دولت کے زور پر گویا خرید لیتے ہیں۔ اسی نظام کا طرۂ امتیاز سود ہے جس کے ذریعے امیروں کی امارت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور غریبوں کی غربت کا گراف آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے۔ نیز معاشرے میں ہمدردی، رأفت و رحمت اور تعاون کے جذبات مفقود ہیں اور صورتحال یہ ہے کہ ؎

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

اشتراکیت (COMMUNISM)

اشتراکیت دراصل سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ردعمل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداواری اور غیر پیداواری سب وسائل عوام کے پاس چلے جاتے ہیں جس کے باعث

صرف چند ایک افراد جائز و ناجائز طریقے سے تمام وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ظالمانہ نظام کے رد عمل کے طور پر یہ سوچ پیدا ہوئی کہ کوئی ایسا نظام ہونا چاہیئے جس کے تحت دولت کی منصفانہ تقسیم ہو سکے۔ چنانچہ یہ سوچ بالآخر پیداواری اور قدرتی و غیر قدرتی اشیاء سرکاری تحویل میں دینے پر منتج ہوئی۔ یعنی اس نظام میں انسانوں کی ذاتی ملکیت کا تصور نہیں پایا جاتا' جس کے باعث معاشی دوڑ میں سعی و جہد کے محرک 'ذاتی نفع' کا متبادل فراہم کرنے کے ضمن میں اشتراکیت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر ایسا ماحول بنا دیا جائے جہاں اجتماعی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہو تو خود بخود عوام اجتماعی بھلائی پسند نقطۂ نظر کے حامل ہو جائیں گے۔

اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کے اصلاحی رد عمل کے طور پر اشتراکی نظام پیش کیا گیا مگر اس نے بھی کوئی خاص فائدہ نہ پہنچایا بلکہ کچھ اور ہی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس نظام کے تحت انسان کے اندر ذاتی منافع کی تحریک ختم ہو گئی۔ اگرچہ اس کے جواب میں اجتماعی مفاد پسند ماحول تیار کرنے کا اصول پیش کیا گیا مگر وہ بری طرح ناکام ہو گیا' اور لوگوں میں معاشی جدوجہد کی تحریک پیدا نہ کی جا سکی جس کے باعث بدکرداری (Corruption)' بددیانتی' خیانت اور رشوت وغیرہ جیسی لعنتوں نے جنم لیا۔

اِس نظام کے تحت افراد کو گویا اجتماعیت کا خادم بنا دیا گیا۔ افراد کا کام محض اجتماعیت کی خدمت کرنا قرار پایا۔ اور یہ خدمت بھی اس اندھا دھند طریقے سے کہ انسان کی حیثیت ایک مشین کی سی رہ گئی۔ کہاں یہ نظریہ کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کہاں یہ نظریہ کہ انسان کی کوئی حیثیت ہی نہیں' وہ تو محض ایک مشین ہے۔ اس نظام کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ یہ امن و امان کے بالکل خلاف ہر طرح کے تشدد پر ہر وقت آمادہ ہے۔ چنانچہ لینن نے ایک موقع پر پارٹی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ہدایت کی کہ :

> "اگر ضرورت پیش آئے تو مزدور تنظیموں میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے' ان میں گھسے رہنے اور ہر قیمت پر اشتراکی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ہر قسم کے حربوں سے بلا تکلف کام لو۔ سازش' جوڑ توڑ' غیر قانونی ذرائع کا استعمال' دھوکہ وغیرہ سب سے

پورا پورا فائدہ اٹھاؤ"۔ (۳)

ظاہر ہے جب تمام وسائل سرکاری تحویل میں لینے ہوں تو لوگوں کو محض وعظ و نصیحت سے تو آمادہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے تمام تر سرمائے سے' جو انہوں نے اپنی کوشش سے حاصل کیا ہے' فوری طور پر دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ اس نظام کی عملی تنفیذ کے لئے جس ظالمانہ طریقے سے لوگوں سے دولت چھیننے کی کارروائیاں کی گئیں' ناقابل تصور ہے۔ اندازوں کے مطابق اس سکیم کو عمل میں لانے کے لئے تقریباً ۱۹ لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا' ۲۰ لاکھ آدمیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں اور چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کو ملک چھوڑ کر دنیا بھر میں تتر بتر ہونا پڑا"۔ (۴) یہی وجہ ہے کہ یہ نظام اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ صرف چین میں کچھ اصلاحات کے ساتھ اسے چلانے کی کوشش جاری ہے۔

اسلامی تہذیب

اسلام کے نزدیک خالق کائنات نے انسان کو خلیفۃ الارض بنا کر مادیت و روحانیت کے امتزاج کے ساتھ اس زمین پر بھیجا ہے اور ساری کائنات کو اس کے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ وہ ہر طرح سے اس خالق کائنات اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت کر سکے' جو اس کا مقصد وجود ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک اس دُنیا کے علاوہ ایک اور دنیا' اُخروی دُنیا بھی ہے اور وہی حقیقی ہے۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اسی دُنیا کی زندگی کے اعمال کے حوالے سے ہو گا۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالائے گا وہ اس اُخروی دُنیا میں کامیاب و کامران ہو گا اور جو نافرمانی کرے گا وہ وہاں خائب و خاسر ہو گا۔ انسان کلیتاً آزاد بھی نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے' اگرچہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چاہے اچھائی کرے چاہے برائی۔ ان امور کی اطلاع کا ذریعہ الہامی تعلیمات ہیں جنہیں ماننے کی مجموعی صورت کو اعتقادات (یعنی ایمانیات) سے تعبیر کیا جاتا ہے' اور ان اعتقادات کو عمل میں ڈھالنے کے لئے اسلام میں ایک جامع نظامِ عبادات ہے' جس میں نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پھر یہ اعتقادات و عبادات

اخلاقیات کے اظہار کا باعث بنتے ہیں جس کا اسلام میں ایک جامع نظام ہے جس میں اخوت و مساوات، ہمدردی، محبت و شفقت، رأفت و رحمت، ایثار و قربانی، حسنِ نیّت اور تقویٰ پر خصوصی زور دیا جاتا ہے۔ اسلام صرف روحانیت پر ہی زور نہیں دیتا کہ مادیت کو مسترد کر دے بلکہ روحانیت و مادیت دونوں کو ایک ہی کل کے دو پہلو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیتا ہے، گو اس میں روحانیت کا پلا بھاری ہے۔ یوں اسلام ایک ایسا نظام تشکیل دیتا ہے جو ایک طرف مادیتِ محضہ کو مسترد کرتا ہے تو دوسری طرف روحانیتِ محضہ یا رہبانیت کو بھی مسترد کرتے ہوئے ان دونوں کو متوازن انداز میں فکری و عملی سطح پر ساتھ لے کر چلنے پر زور دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اہلِ دین اہلِ دُنیا اور اہلِ دُنیا اہلِ دین بھی ہیں۔

مادیت و روحانیت کے حسین اور متناسب امتزاج پر مبنی یہ تہذیب اسی حوالے سے حقوق و فرائض اور مَرد و زن کے تعلق کی بھی توضیح کرتی ہے۔ چنانچہ بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت اور مرد و زن کے مخصوص دائرہ کار کی تعیین کی طرح بہت سی ایسی تعلیمات اس تہذیب کا مجموعہ ہیں جن سے شرفِ انسانیت کو تقویت ملتی ہے اور انسان حقیقی معنوں میں دوسری کمتر مخلوقات سے افضل (اشرف المخلوقات) قرار پاتا ہے۔ پھر یہ کوئی تخیلاتی یا محض تصوراتی افکار نہیں ہیں، ابتدائے اسلام سے آج کے اس انحطاط پذیر دور تک کسی نہ کسی صورت میں ان اصولوں پر عمل ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ان تعلیمات کی روشنی میں ایک ایسی تہذیب وقوع پذیر ہے جس میں اخوت و مروّت اور بھائی چارے کا یہ عالم ہے کہ اس حلقے میں آتے ہی نسلی، لسانی اور علاقائی بُعد کے بُت پاش پاش ہو جاتے ہیں اور ایسی شاندار مثال ملتی ہے جو تاریخ انسانی میں دو سگے بھائیوں کے مابین ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاتِ مدینہ۔ ایثار و قربانی کا یہ عالم ہے کہ اپنی جان چلی جائے پروا نہیں، دوسرا مسلمان بھائی بچ جائے۔ اس کی مثال اس جنگ کے دوران ملتی ہے جس میں اسی جذبے کے پیشِ نظر تین مجاہدین اسلام نے اپنی اپنی جانیں قربان کر دیں۔ نسلی امتیاز کا ایسا خاتمہ کہ غلامِ حبشی تک سردار کہلانے لگے۔ ملاحظہ ہو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عزت و تکریم۔ مساوات کا ایسا جامع نمونہ کہ چھوٹا ہو

یا بڑا' امیر ہو یا غریب' سیاہ فام ہو یا سفید فام' صاحب اختیار ہو یا عام رعیت' سب حقوق و فرائض اور قانونی اعتبار سے برابر ہیں' اور کوئی معیار فضیلت ہے تو وہ بلند اخلاق اور نیک سیرت ہے۔

معاشرتی سطح پر زندگی کی ضرورتوں اور کفالتوں میں جملہ نوعِ انسانی ایک برادری کی مانند ہے اور اس خاص دائرے میں زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق سب کو ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین کے لئے نظامِ نکاح کے تحت مناسب راستہ اختیار کیا گیا ہے اور خاندانی نظام کی مضبوطی کا ہر ممکن خیال رکھا گیا ہے۔ طلاق اگرچہ ممنوع نہیں لیکن ابغض الحلال قرار دی گئی ہے تاکہ خاندانی نظام اگر کم از کم حد تک تسلی بخش طور پر چل رہا ہے تو بلاوجہ چھوٹی چھوٹی باتوں یا محض لذت آفرینیوں کی خاطر خاندانی نظام کو نقصان نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا خاندانی نظام پوری طرح مضبوط اور مستحکم ہے۔ چنانچہ "دی نیو بک آف ورلڈ رینکنگ" کی ایک رپورٹ کے مطابق شرح طلاق میں پاکستان ۱۰۲ ممالک کی فہرست میں بہت پیچھے ہے اور اس کا نمبر ۸۷ واں ہے' جہاں ایک ہزار جوڑوں میں سے صرف ۰.۳ کو طلاق ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے کم طلاقیں زائرے' موزنبیق اور کشمیر میں ہوتی ہیں جہاں یہ شرح ۱.۰ سے صفر تک فی ہزار ہے۔[۵] اسی طرح مانع حمل ادویات کے استعمال' اسقاط حمل اور ناجائز تعلقات وغیرہ کی شرح مسلمان ممالک میں مطلوبہ گراف تک کم ہی پہنچتی ہے۔ علاقائیت' رنگ و نسل اور لسانی امتیازات سے یہ تہذیب بالکل مبرا ہے' کوئی مسلمان چاہے دنیا کے کسی کونے میں رہتا ہو' کسی رنگ و نسل سے متعلق ہو اور کوئی زبان بولتا ہو حقوق و فرائض' عزت و تکریم اور شرفِ انسان کے اعتبار سے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں مختلف گروہ اور قبیلے کسی امتیاز کی علامت نہیں' بلکہ باہمی پہچان کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک ایسی مثالی تہذیب ہے جس میں تمام لوگ نہ صرف بغیر کسی فرق و امتیاز کے ہم رنگی و یک رنگی کے ساتھ مجتمع ہو سکتے ہیں بلکہ یکساں ترقی بھی کر سکتے ہیں۔

اسلام کامعاشی نظام

اسلام کے نزدیک دولت بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ جہاں تک یہ دولت انسان کے فلسفۂ حیات 'بندگی رب برائے رضائے الٰہی نتیجتاً حصول جنت کے لئے ضروری ہے' اس حد تک اسلام دولت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ پھر اگرچہ اسلام اجتماعیت کی اہمیت پر زور دیتا ہے 'لیکن یہ اجتماعیت کے غلبہ واقتدار کو اسی حد تک درست سمجھتا ہے جس حد تک یہ فرد کے لئے مفید ثابت ہو۔ اس لئے کہ اصل اہمیت تو فرد کی ہے' بحیثیت ایک فرد کے اسے ہی جواب دہی کرنی ہے۔ چنانچہ اسلام کا پورا معاشی نظام انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ یوں اسلام کے معاشی نظام کے مطابق افراد کو شخصی ملکیت اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے 'لیکن ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ (النساء : ۲۹) کے حکم کے ذریعے اس اختیار کی تحدید کی گئی ہے کہ اس اختیار کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کیا جائے اور اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے۔ اسلام دولت کو جمع کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (التوبہ : ۳۴) اور ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے پر زور دیتا ہے ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (البقرۃ : ۲۱۹) اور اگر دولت جمع ہو بھی جائے تو اس کے غیر منصفانہ طور پر سمٹ جانے کے متوقع امکان کو رفع کرنے کے لئے قانونی طور پر زکوٰۃ' عشر' قانون وراثت اور جنگ سے حاصل شدہ مال یعنی مال غنیمت وغیرہ کی تقسیم کے اصول کی صورت میں اور اخلاقی طور پر دوسروں کی عام مالی امداد کرنے اور قرض حسن (بلا سود قرض) کو بصورت مجبوری معاف کرنے کی صورت میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے اور اس طریقے سے لوگوں کے ذہنوں میں باہمی امداد و تعاون' رافت و رحمت اور ہمدردی کے مثبت جذبات پیدا کئے جاتے ہیں۔ اسلام سود کو بد ترین حرام قرار دے کر یہ فلسفہ پیش کرتا ہے کہ سودی کاروبار کرنے سے مال گھٹتا اور غیر سودی کاروبار سے مال بڑھتا ہے۔ ساتھ ہی جوا' سٹہ بازی'

شراب اور دیگر ایسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دیتا ہے جن کا کوئی جسمانی' روحانی یا دماغی فائدہ نہیں ہوتا۔

اسلام کے معاشی نظام میں فرد اور اجتماعیت کو ان کا اصل مقام دیا گیا ہے' نہ فرد کو بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اجتماعیت کے لئے سوہان روح بن جائے اور نہ ہی اجتماعیت کو فرد کا آقا قرار دے کر اس کی انفرادی حیثیت کو ختم کیا گیا ہے۔ اگر ہزاروں لوگوں کے پاس کافی رقم موجود بھی ہوگی تو بھی دوسرے لوگ محروم نہیں ہوں گے' انہیں نان نفقہ وغیرہ کے لئے مناسب رقم میسر ہوگی۔ اور اصلاً سودی کاروبار نہ کرنے سے دولت کے بڑھنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب دولت سمٹ کر محض چند ہاتھوں میں رہ جاتی ہے تو اس سے صرف جمہور کی قوتِ خرید ہی کمزور نہیں ہوتی خود دولت مند ہاتھوں میں موجود دولت بھی بے مصرف ہو کر رہ جاتی ہے' جب کہ غیر سودی کاروبار سے نہ صرف دولت کے گردش میں رہنے سے جمہور کی قوتِ خرید برقرار رہتی ہے بلکہ دولت مندوں کی دولت بھی بے مصرف نہیں ہوتی۔

اسلام کا سیاسی نظام اور جمہوریت

اسلام کے نزدیک انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یا نائب ہے اور اس کا کام اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کو چلانا ہے۔ انسان اپنی طرف سے کوئی بنیادی اصول وضع کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ انسان اگر خود سیاسی نظام کے بنیادی اصول وضع کرنے لگ جائیں تو جس طرح کے لوگ یہ نظام بنائیں گے انہی کے مفاد یا تجزیئے کے مطابق یہ نظام ہوگا اور سب کے لئے یکساں طور پر مفید اور مؤثر ثابت نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد یہی اصول ہے کہ حاکمیت اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کے تمام تقاضوں کو پوری طرح مدنظر رکھتے ہوئے وہی ایک ہستی ہے جو بالکل درست اور صحیح حکم دے سکتی ہے۔ جب کہ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان ہی حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) کا مالک و مختار اور ابراہام لنکن (Abraham Lincon) کی مشہور و معروف تعریف (Definition) کے مطابق :

"Democracy is the Government of the people for the people and by the people"

اب ظاہر ہے انسان کو اس طرح کا حق دے دیا جائے تو وہ بیک وقت مجموعی انسانیت کی ضروریات' مزاج اور وقت و حالات کے تقاضوں کا لحاظ کیسے کر سکتا ہے کہ کوئی مناسب حکم جاری کر سکے!

اسلامی نظام سیاست میں قانون سازی قرآن مجید اور سُنّتِ رسول ﷺ میں دیئے گئے احکامات کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ البتہ ان حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کے حالات کے پیش نظر بوقت ضرورت قانون سازی کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے بر عکس مغربی جمہوریت میں عوام کی اکثریت اپنے لئے جو اور جیسا قانون بنالے' اس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

اسلامی نظام سیاست میں یہ لازم ہے کہ مجلس قانون ساز مخلوط قومیت پر مبنی نہ ہو بلکہ قانون سازی کے حساس معاملات صرف مسلمان ہی انجام دیں' اس لئے کہ اصلاً قانون سازی تو انہی کے نظریات اور اعتقادات کے تحت ہونی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نظام حکومت میں غیر مسلموں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ انہیں بھی انفرادی سطح پر اپنے اعتقادات و نظریات کے مطابق آزادی کے ساتھ رہنے کا مکمل تحفظ فراہم کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اسلامی نظامِ سیاست کے مطابق نظام مملکت چلانے والے سربراہ کے لئے تمام مسلمان باہمی مشورے سے اپنے میں سے سب سے زیادہ نیک اور دنیوی معاملات میں مہارت رکھنے والے فرد کا انتخاب کریں گے اور اس میں بھی صائب الرائے حضرات کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گی' جب کہ مغربی جمہوریت میں اس طرح کا کوئی اصول نہیں' عوام اپنی مرضی سے جسے چاہیں منتخب کر لیں' چاہے وہ کوئی غنڈہ یا بدمعاش ہو یا کوئی بڑا مجرم' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

گویا مغربی جمہوریت اپنے موجودہ اصولوں کے تحت تمام انسانیت کے لئے یکساں

طور پر مؤثر و مفید ثابت نہیں ہو سکتی' البتہ اگر اس میں اسلامی نظام سیاست کے مذکورہ اصولوں کو شامل کرتے ہوئے اس کے منفی اور شر انگیز اصولوں کو خارج کر دیا جائے تو یہ ایک اچھا سیاسی نظام بن سکتی ہے اور اسلام میں بھی ایسے نظام کی گنجائش موجود ہے۔

نوعِ انسانی کا فکری سفر

بعض اوقات ظاہری حالات و واقعات کسی واقعہ کے رونما ہونے کے ضمن میں بالکل مختلف ہوتے ہیں لیکن بالآخر اندرونی حالات کے تحت جس واقعہ نے مشیت ایزدی کے مطابق رونما ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ؎

خواجہ ز سروری گذشت　　بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت　　دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بت گری گذشت　　مے نگریم و مے رویم!

اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ظاہری اعداد و شمار کے نتیجے میں یاسیت و نومیدی کی بجائے دقت نظر سے حالات جائزہ لیں۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب سے انسان نے الہامی تعلیمات سے ہٹ کر محض عقلی بنیادوں پر نظام حیات مرتب کرنے کی کوشش کی اُسے اس تجربے کے ہر موڑ پر بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا' لیکن یہ حقیقت بہرصورت ماننی پڑتی ہے کہ اس نے اس شکست سے حقیقت کی طرف ضرور قدم آگے بڑھایا۔ اسی سفر کا نتیجہ ہے کہ متعدد نظریہ ہائے حیات ابھرتے اور مسترد ہوتے گئے اور اب نوعِ انسانی اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ اس کے پاس حقیقتاً دو ہی نظام باقی رہ گئے ہیں' ایک اسلام اور دوسرا سیکولرزم یا مغربی نظام۔ تاحال اگرچہ سیکولرزم پوری قوت اور تمام تر ہتھکنڈوں کے ساتھ اسلام کو مٹانے کی فکر میں ہے اور اس حد تک اُسے کامیابی بھی حاصل ہے کہ اس نے بہت سے مسلمانوں کو تہذیبی غلامی کا طوق پہنا دیا ہے اور وہ پوری قوت کے ساتھ دُنیا کو اسلام کی برکات کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا ہے' لیکن یہ تمام تر کوششیں دراصل اس کے اپنے پیش کردہ اصولوں ہی کی بھینٹ چڑھ جائیں گی۔ مغرب کی بے قید آزادی کے نتیجے میں ہی وہاں کی نئی نسلیں اسلام کو سمجھنے لگی ہیں یعنی اسلام کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادی سے مسلمان

فائدہ اٹھاتے ہوئے تبلیغ دین کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عصر حاضر میں خاص طور پر سائنسی ترقی کے باعث کمپیوٹر کی ایجاد سے فکری و نظری طور پر اسلام کی روشن اور کامل تعلیمات کو سمجھنے کی رکاوٹیں مزید کم ہو گئی ہیں۔ فی الوقت اگر اس میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ خود امت مسلمہ ہے۔ ایک طرف امت مسلمہ کی نگاہیں کافی حد تک مغربی تہذیب کی چکاچوند سے خیرہ نظر آتی ہیں تو دوسری طرف مثبت طور پر خود ان کے ہاں وہ نظام عدل اجتماعی جس کے وہ امین اور علمبردار ہیں، کہیں عملی صورت میں جلوہ گر نظر نہیں آتا کہ اس کی برکات کا عملی مشاہدہ کرتے ہوئے لوگ کھنچے چلے آئیں۔ تاہم یہ بات خوش آئند ہے کہ عالم اسلام میں وسیع پیمانے پر احیائی تحریکیں احیائے اسلام کی جدّوجُہد میں اپنے اپنے انداز میں مصروف ہیں۔

مسلمانوں میں احیائی تحریک

یہ تحریکیں اگرچہ خود وقت اور حالات کے سیلِ رواں کے سامنے قدم جمانے میں پوری طرح کامیاب نہیں لیکن اس احیائی عمل کو تیز تر کرنے اور اُمّتِ مسلمہ میں بحیثیتِ مجموعی بیداری کی لہر پیدا کرنے میں بہرحال کامیاب ہیں۔

مسلمانانِ عالم کے لئے پیغام امید اور پاکستانیوں کے لئے لمحہ فکریہ

مغرب کی اسلام کی طرف بھرپور رغبت و توجہ اور خود مسلمانوں میں احیائی عمل کی لہر وہ خارجی عوامل ہیں جن کے باعث مذہبی وابستگی سے ہٹ کر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والا دور احیائے اسلام کا دور ہو گا۔ لیکن مسلمانانِ عالم کے لئے خاص طور پر امید افزا ہی نہیں یقینی پیغامِ سعادت ان دو مظاہر سے بھی بڑھ کر قرآن و حدیث نے دیا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ :

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (الصف : ۸)

"یہ لوگ اپنے مُنہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

اور فرمایا:

﴿ وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْامِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ ﴾ (النّور: ۵۵)

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' اور ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا"۔

اور حدیثِ نبویؐ میں ہے کہ :

((لَايَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ ' اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا ' اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) (مسند احمد)

"روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ یعنی یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی تابعداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے!"

چنانچہ احادیث مبارکہ کے مطابق آدم و ابلیس سے شروع ہونے والے اس معرکہ خیر و شر میں آخری معرکہ الملحمۃ العظمٰی (Armageddon) ہو گا' جس میں شر کی طرف سے ابلیس اپنی ذُریتِ صُلبی و معنوی (خصوصاً یہود) کے ساتھ نمودار ہو گا اور اس کی مدد المسیح الدّجال کرے گا۔ اور خیر کی طرف سے مہدی موعود صف آراء ہوں گے جن کی مدد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کریں گے اور زمینی مدد مشرق سے خراسان (پاکستانیوں کے لئے لمحہ فکریہ کہ اس میں ان کا کچھ علاقہ بھی شامل ہے) سے فوجوں کی صورت میں

ہو گی۔ اس میں خیبر کی فتح کے ساتھ ہی اسلام پورے کرۂ ارضی پر غالب آ جائے گا۔ جو لوگ اسلام کی طرف رغبت رکھتے ہیں انہیں "بعِزِّ عزیزٍ" کی سعادت نصیب ہو گی اور جو "نیو ورلڈ آرڈر" کے خواب دیکھ رہے ہیں' نیست و نابود ہو جائیں گے یا "ذُلِّ ذلیلٍ" کی عملی تصویر بن جائیں گے ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

حواشی

(۱) ترجمان القرآن' جلد ۵۱

(۲) ہفت روزہ "زندگی" لاہور' ۷ا مئی ۹۷ء

(۳) اسلام یا سوشلزم' از پروفیسر خورشید احمد

(۴) اسلام اور جدید معاشی نظریات' از مولانا مودودی

(۵) ندائے خلافت' جولائی ۹۶ء

عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم :

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"

April 2000 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 19

Hikmat-e-Quran

LAHORE No.4

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ